اجتماعِ کراچی کی افتتاحی تقریر

[یہ وہ تقریر ہے جو ۱۰ نومبر کو جماعت اسلامی کے اجتماع عام کا افتتاح کرتے ہوئے کراچی میں کی گئی تھی]

حمد و ثنا کے بعد:۔

رفقائے جماعت و برادرانِ دین! کئی سال کے بعد آج مجھے یہ موقع نصیب ہوا ہے کہ اپنی جماعت کے تمام رفقاء کو یک وقت خطاب کر سکوں۔ ۱۹۴۶ء میں جماعت کا اجتماعِ عام الہ آباد میں ہوا تھا جبکہ ملک ابھی تقسیم نہ ہوا تھا۔ اس وقت سارے ہندوستان (مع پاکستان) کے رفقا جمع ہوئے تھے۔ مگر میں اپنی بیماری کی وجہ سے اجتماع کی کارروائی میں حصہ نہ لے سکا۔ پھر ۱۹۴۹ء میں پاکستان کی جماعت کا اجتماعِ عام لاہور میں منعقد ہوا۔ مگر میں آپ کے درمیان موجود نہ تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج برسوں بعد آپ کا یہ مجمع میری موجودگی میں اکٹھا ہوا ہے اور میں اسے خطاب کر رہا ہوں۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس اجتماع کو ہمارے لئے مبارک بنائے اور ہم سے اپنے دین کے قیام و اعلاء کی خدمت لے۔

یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ ہمارا یہ اجتماع پاکستان کے دارالسلطنت میں منعقد ہو رہا ہے، جو اس ملک میں جغرافی طور پر نہ سہی معنوی حیثیت سے ضرور مرکزی مقام ہے۔ یہاں پورے ملک کے اہلِ دماغ کا نچوڑ موجود ہے۔ یہاں کی آبادی پورے ملک میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور سب سے بڑھ کر ذی شعور ہے۔ اور خدا کرے کہ سب سے بڑھ کر بیدار بھی ہو۔

اس مرکزی مقام پر، اس کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنی اس تقریر میں بیرونِ ملک اور اندرونِ ملک کے تمام اہم مسائل پر اظہارِ رائے کروں، اور ملک کے داخلی حالات پر تبصرہ کرنے کے ساتھ یہ بھی بتاؤں کہ ان حالات کی اصلاح کے لئے ہمارے پاس کیا پروگرام ہے، اس

موقع پر جو کچھ میں عرض کروں گا وہ محض میری ذاتی رائے ہی نہ ہوگی، بلکہ جماعت اسلامی کے نقطۂ نظر اور پالیسی اور پروگرام کی توضیح ہوگی۔

لیاقت علی خاں مرحوم کا قتل

کسی دوسرے مسئلے پر گفتگو کرنے سے پہلے میں اُس حادثۂ عظیم پر اپنے اور اپنی جماعت کے دلی رنج و افسوس کا اظہار کرتا ہوں جو ابھی پچھلے ہی مہینے ہمارے ملک میں رونما ہوا ہے یعنی مسٹر لیاقت علی خاں مرحوم کا قتل۔ یہ واقعہ نہ صرف شخصی حیثیت سے دردناک ہے، نہ صرف اخلاقی حیثیت سے شرمناک ہے، بلکہ اس لحاظ سے پورے ملک کے لئے افسوسناک بھی ہے کہ ایک نہایت نازک موقع پر، جبکہ ہمارا ملک خطرات سے گھرا ہوا ہے، ایک ایسا شخص ہمارے درمیان سے زبردستی ہٹا دیا گیا جو یہاں کے معاملات کی سربراہ کاری کا سارا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا جس سے زیادہ با اثر اور ذمہ دار شخصیت ہمارے یاں موجود نہ تھی۔ اُن سارے اختلافات کے باوجود جو ہمیں اُن کی پالیسی اور طریق کار سے تھے، ہم اس بات کے معترف ہیں کہ انہوں نے بڑے نازک زمانے میں اس ملک کے نظم و نسق کی ذمہ داری سنبھالی اور اپنی قابلیت کے مطابق اس نوزائیدہ مملکت کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کی پوری کوشش کی۔ اس کارِ عظیم میں ان کی محنت و جانفشانی کا اعتراف ہر وہ شخص کرے گا جس نے پچھلے سوا چار سال کی مشکلات کو دیکھا ہے۔

پھر یہ واقعہ اس لحاظ سے خطرناک بھی ہے کہ یہ اس ملک میں ایک بہت بُرے رجحان کے اُبھرنے کی علامت ہے۔ اگرچہ ہر دست یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس حرکت کا محرک کیا تھا — کوئی سیاسی محرک تھا یا شخصی — لیکن اگر فی الواقع وہ کوئی سیاسی محرک تھا تو یقیناً یہ حالات کو ایک ایسے رُخ کی طرف موڑنے والی حرکت ہے جس کی ہر اُس شخص کو مذمت کرنی چاہیئے جو اس ملک اور اس ملت کی فلاح چاہتا ہو۔ کسی ملک کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی بدقسمتی نہیں ہو سکتی کہ اس میں فیصلے کا آخری اختیار عقل، شعور، دلیل اور رائے عام سے چھین کر قاضیٔ شمشیر کے سپرد کر دیا جائے۔ یہ

قاضی کوئی عادل اور صاحب فکر قاضی نہیں ہے۔ یہ اندھا، بہرا اور گونگا قاضی ہے۔ اس سے جب کبھی فیصلہ چاہا گیا ہے، اس نے حق اور انصاف دیکھ کر نہیں بلکہ خون کی رشوت لیکر فیصلہ کیا ہے، اور جس نے بھی زیادہ خون چٹا دیا ہے اُسی کے حق میں اس نے فیصلہ دے دیا ہے خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر، خواہ وہ نیک ہو یا بد۔ کوئی قوم جو خود اپنی دشمن نہ ہو اور جس کی عقل کا دیوالہ نہ نکل چکا ہو ایسی بیوقوف نہیں ہو سکتی کہ اپنے معاملات کا فیصلہ شعور و استدلال کے بجائے تلوار کے اندھے اور رشوت خوار قاضی کے حوالہ کر دے۔ اگر ہم اپنا مستقبل تاریک نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں پوری طاقت کے ساتھ اپنے ملک کے حالات کو اِس خطرناک رُخ پر جانے سے روکنا چاہیئے۔

اس کے ساتھ یہ اندوہناک واقعہ ہم سب کے لیے اپنے اندر ایک اخلاقی سبق بھی رکھتا ہے۔ اس سے پہلے ہم سُن چکے ہیں کہ ہمارے ملک میں ایک سازش ہوئی تھی جس کا مقصد فوجی طاقت سے سیاسی انقلاب برپا کرنا تھا۔ اور اب ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ ہمارے سب سے بڑے ذمہ دار سیاسی لیڈر کو علی الاعلان قتل کر دیا گیا۔ ہمیں واقعات کی اس منطق کو سمجھنا چاہیے۔ یہ واقعات ہمیں ایک تنبیہ کر رہے ہیں۔ اُس تنبیہ کو غفلت سے نظر انداز کر دینا مناسب نہیں ہے۔ ہمیں اور خصوصاً ہمارے ذمہ دار لوگوں کو یہاں ایسے حالات پیدا کرنے اور قائم رکھنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے جن میں ہر وہ سیاسی تغیر پرامن طریقے سے ہو سکتا ہو جس کے حق میں رائے عام ہموار ہو جائے، اور کوئی ایسی وجہ باقی نہ رہے جس کی وجہ سے لوگ یہ سوچنے لگیں کہ قومی اور سیاسی معاملات کا فیصلہ مصنوعی اور جبری تدابیر اختیار کیے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ برطانیہ ایک غیر مسلم ملک ہے، مگر حکمت بہرحال مومن کی کھوئی ہوئی متاع ہے جہاں سے بھی یہ ملے اسے لینا چاہیے۔ ہمارے لیے برطانوی قوم کے طرزِ عمل میں ایک سبق موجود ہے جس سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں کوئی فوجی یا غیر فوجی سازش نہیں ہوتی۔ کوئی خفیہ تحریک نہیں اٹھتی۔ کوئی انگریز، خواہ وہ ملک کے رائج الوقت نظام سے کتنا ہی سخت اختلاف رکھتا ہو، کبھی یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ اسے اپنے ملک کے کسی لیڈر یا حکمراں کو قتل کر دینا چاہیے۔ بڑے سے بڑے انقلابی خیالات رکھنے

والے آدمی کے ذہن میں بھی وہاں یہ تخیل راہ نہیں پاتا کہ جس انقلاب کا وہ خواہش مند ہے اسے برپا کرنے کے لیے فلاں شخص یا فلاں اشخاص کو قتل کر دینا مفید یا ناگزیر ہے۔ غور کیجیے کہ اس کا سبب کیا ہے؟ درحقیقت یہ سب کچھ اس بات کا ثمرہ ہے کہ وہاں ایسے حالات پیدا کیے گئے ہیں جن میں ہر شخص اپنے نظریے اور پروگرام کے حق میں رائے عام کو ہموار کرنے کی کوشش کر سکتا ہے، اور ہر شخص کو پورا اطمینان ہے کہ جب بھی وہ رائے عام کو ہموار کرے گا، ملک کا نظام اس کے منشا کے مطابق بدل جائیگا۔ وہاں اگر کسی کی بات نہیں چلتی تو اس لیے نہیں کہ کسی نے طاقت سے اس کا راستہ روک رکھا ہے، بلکہ صرف اس لیے کہ رائے عام اس کے حق میں نہیں ہے۔ یہ چیز اس کو پستول چلانے کے بجائے اپنی بات کو پھیلانے اور عوام کو اپنے دلائل سے مطمئن کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اسے کبھی یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ وہ اُن ذرائع سے محروم کر دیا جائے گا جن سے وہ اپنے حق میں رائے عام کو ہموار کر سکتا ہو۔ اور اس کو کبھی یہ خطرہ بھی لاحق نہیں ہوتا کہ انتخابات میں کوئی بااختیار شخص یا گروہ اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر رائے عام کے بالکل برعکس نتائج حاصل کرے گا۔ یہی چیز ہے جس کی بدولت برطانیہ میں ہر تغیر بالکل پُرامن اور معقول طریقے سے ہو جاتا ہے، اور باشندگانِ ملک میں جبری انقلاب یا سیاسی قتل و خون کا رجحان پیدا ہونے ہی نہیں پاتا۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایسی ہی حالت ہمارے ملک کی بھی ہو جائے اور یہاں اُن اسباب کی جڑ کاٹ دی جائے جو سازشوں اور خفیہ تحریکوں اور مجرمانہ اقدامات کے محرک بنتے ہیں۔

خارجی مسائل

اب میں سب سے پہلے خارجی مسائل کا ـــــ اُن خارجی مسائل کا جو ہمارے لیے کسی نہ کسی حیثیت سے دلچسپی کے موجب ہیں ـــــ ایک مختصر جائزہ لونگا۔

مصر، ایران اور شمالی افریقہ ہمیں ہر حیثیت سے قریبی ترین دلچسپی جس معاملہ میں ہے وہ اُن مسلم ممالک کا معاملہ ہے جن سے اس وقت مغرب کی جابر طاقتوں کی کشمکش چل رہی ہے۔ ایران

مصر، شمالی افریقہ، یہ وہ ممالک ہیں جن پر ایک مدت دراز سے انگلستان اور فرانس دست درازی کرتے رہے ہیں، اور اب یہ اپنے نقصانات کی تلافی اور اپنے کھوئے ہوئے حقوق کی واپسی کے لیے کوشاں ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم کی برکات میں سے ایک برکت یہ ہے کہ اُن ظالم قوموں کا زور ٹوٹ گیا ہے جو دنیا بھر کے لیے بلائے بے درماں بنی ہوئی تھیں۔ جن کی سلطنت میں سورج غروب نہ ہوتا تھا، اب ان میں وہ غروب ہونے لگا ہے۔ جو سمندر کی لہروں پر حکمرانی کر رہے تھے، اب ان کے چنگل سے لہریں آزاد ہو رہی ہیں۔ مغلوب اور مظلوم ملکوں کو اب یہ موقع مل گیا ہے کہ جس گرفت میں وہ جکڑے ہوئے تھے اس سے نکلیں اور جو کچھ ناروا طریقے پر اُن سے لیا گیا تھا اسے واپس لیں۔ لیکن ظالم طاقتیں کمزور ہو جانے کے باوجود ابھی تک ہر اُس چیز کو دانتوں سے پکڑے ہوئے ہیں جو اپنے زور کے زمانے میں انہوں نے کمزوروں سے چھینی تھی۔ اس طرح مشرق سے لیکر مغرب تک ایک کشمکش برپا ہو گئی ہے۔

اس معاملہ میں ہماری ساری ہمدردیاں اُن ملکوں کے ساتھ ہیں جو اپنے جائز حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ہماری ہمدردی صرف اسی بنیاد پر نہیں ہے کہ وہ مسلمان ہیں، بلکہ اس بنیاد پر بھی ہے کہ وہ مظلوم ہیں، حق ان کے ساتھ ہے، اور اُن کے حریف سراسر ناحق پر ہیں۔ ہماری دلی خواہش یہ ہے کہ اس دنیا سے ظلم مٹے اور انصاف کا بول بالا ہو۔

اس سلسلہ میں ایک اہم سوال بھی ہے جسے میں اس موقع پر صاف کر دینا چاہتا ہوں۔ میں نے بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ کھٹک پائی ہے، اور انگریزی پریس نے اس کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے کہ ایران اور مصر، دونوں نے اپنے اپنے معاہدات کی یک طرفہ تنسیخ کر دی ہے، حالانکہ معاہدے کا دوسرا فریق اس پر راضی نہ تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ اس طرح کسی معاہدے کو ایک فریق فسخ کرنے کا کیسے مجاز ہو سکتا ہے؟ یہ ایک اخلاقی سوال ہے جسے وہ لوگ تو نظر انداز کر سکتے ہیں جن کے نزدیک اصل اہمیت صرف قومی مفاد کی ہے اور جن کی رائے میں قومی مفاد کا اگر تقاضا ہو تو اس پر ہر اخلاقی اصول قربان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم اسے کسی طرح نظر انداز نہیں

کر سکتے، کیونکہ ہمارے نزدیک اخلاق ہر چیز پر مقدم ہے اور فائدہ ہو یا نقصان، ہر صورت میں اخلاقی اصولوں کی پابندی ہونی چاہیے۔ اس لیے میں اس سوال کا یہاں جواب دینا چاہتا ہوں تاکہ جن لوگوں کے دلوں میں اس معاملے کے متعلق کھٹک موجود ہے ان کی کھٹک بھی دور ہو جائے اور ہمارے متعلق بھی کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم نے اخلاق کے سوال کو نظر انداز کر کے کسی بے جا حمیت کی بنا پر اس معاملہ میں مصر و ایران کی حمایت کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اصول اخلاق کے لحاظ سے بہت بڑا فرق ہے اُن معاہدات میں جو دو فریق اپنی آزاد مرضی اور مساویانہ طریقہ سے باہم طے کریں، اور اُن معاہدات میں جو ایک فریق کی کمزوری یا مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دوسرا فریق حاصل کرے۔ اخلاق کی نگاہ میں یہ دو الگ الگ نوعیتوں کے معاہدے ہیں اور ان دونوں کا حکم ہرگز یکساں نہیں ہو سکتا۔ جو معاہدے فریقین کی آزادانہ رضامندی سے مساویانہ طریقے پر طے ہوئے ہوں وہ یقیناً وزنی اور قیمتی معاہدے ہیں، ان کی پوری پوری پابندی ہونی چاہیے، ان کی خلاف ورزی حرام ہے، ان میں کسی قسم کے ردو بدل کا ایک فریق کو حق نہیں پہنچتا۔ لیکن جو معاہدہ فریقین کی آزادانہ رضامندی سے مساویانہ طریقے پر طے نہ ہوا ہو، بلکہ جس کو ایک فریق نے اپنے زور سے حاصل کیا ہو اور دوسرے نے اپنی کمزوری یا مجبوری کی بنا پر مانا ہو، وہ اخلاقی حیثیت سے کوئی وزن اور قیمت نہیں رکھتا۔ اس کا قیام و بقا اخلاق پر نہیں بلکہ فریقین کے حالات پر منحصر ہے۔ جب تک وہ حالات باقی رہیں جن میں اس نوعیت کا معاہدہ ہوا تھا، صرف اسی وقت تک ایسا معاہدہ نافذ العمل رہ سکتا ہے۔ اور جب حالات بدل جائیں، جب ظالم کا زور ٹوٹ جائے اور مظلوم کی کمزوری یا مجبوری باقی نہ رہے، ایسے معاہدے کو آپ سے آپ ٹوٹ جانا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ جو اخلاقی ذمہ داری مظلوم فریق پر عائد ہوتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ حالات بدل جانے پر وہ پہلے ظالم فریق کو معاہدے پر نظر ثانی کرنے کی دعوت دے۔ لیکن اگر اس کے دعوت دینے کے باوجود ظالم فریق نہ مانے تو مظلوم فریق کو پورا حق پہنچتا ہے کہ اس کا معاہدہ اس کے منہ پر مار دے، یا

معاہدے میں انصاف کے مطابق مناسب ترمیم کر دے۔

یہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں یہ کوئی میرا من گھڑت اخلاقی اصول نہیں ہے، بلکہ شریعتِ اسلامی میں اس کی بنیاد موجود ہے۔ اسلامی قانون سود کے معاہدے کو تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ اس میں ایک فریق اپنی برتر مالی پوزیشن کی بنا پر سود کی شرط عائد کرتا ہے اور دوسرا فریق اپنی مالی کمزوری اور اپنے حالات کی مجبوری سے اس شرط کو قبول کرتا ہے۔ اسی طرح اسلامی قانون بیعِ مضطر کو بھی تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ اس میں ایک فریق دوسرے کو پریشان حال دیکھ کر اس کی ۱۰۰ روپے مالیت کی چیز کے پانچ روپے دام لگاتا ہے، اور دوسرا فریق اپنی مصیبت سے مجبور ہو کر ان داموں اپنی چیز بیچ دیتا ہے۔ یہ اصول صرف شخصی معاملات تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ بین الاقوامی معاملات میں بھی اس کی نظیریں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر صلح حدیبیہ کے معاہدے کو لیجیے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کفارِ مکہ کے درمیان طے ہوا تھا۔ اس معاہدے میں من جملہ دوسری شرائط کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ مدینے سے جو لوگ بھاگ کر مکہ جائیں گے انہیں تو کفارِ مکہ واپس نہ کریں گے، مگر مکہ سے جو لوگ بھاگ کر مدینے جائیں گے انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم واپس کر دیں گے۔ یہ صریح طور پر ایک غیر معقول اور غیر منصفانہ شرط تھی جو کفارِ مکہ کے اصرار پر مانی گئی تھی۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اس مجبوری سے اس کو قبول کیا تھا کہ کفارِ مکہ اس کے بغیر آپ کو اور مسلمانوں کو زیارتِ کعبہ کا حق دینے کے لیے تیار نہ تھے، حالانکہ عرب کے قدیم ترین مسلمہ قاعدے کے مطابق نہ حرم کعبہ اہلِ مکہ کی جائداد تھا اور نہ انہیں کسی کو اس کی زیارت سے روکنے کا، یا اس پر کوئی شرط عائد کرنے کا حق تھا۔ اس لیے ان کی یہ شرط قطعی غیر منصفانہ تھی اور ایک صاحبِ حق کی مجبوری سے بالکل ناجائز فائدہ اٹھا کر منوائی گئی تھی۔ اب دیکھیے کہ قرآن اس شرط کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے۔ جہاں تک مردوں کا تعلق تھا، قرآن نے اس کو باقی رہنے دیا۔ مگر جب کچھ عورتیں مکہ سے ہجرت کر کے مدینے آئیں اور کفارِ مکہ نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا، تو قرآن میں صاف حکم آگیا کہ ان عورتوں کو واپس نہ کیا جائے۔ یہ صریح طور پر بین الاقوامی معاہدے کی یک طرفہ ترمیم تھی

اور اس کے جواز کی اس کے سوا اور کوئی بنیاد نہ تھی کہ جس معاہدے کو ایک فریق نے دوسرے فریق کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تسلیم کرایا ہو اس کی اخلاقی حیثیت ہرگز وہ نہیں ہے جو فریقین کی مساویانہ اور آزادانہ مرضی سے طے کیے ہوئے معاہدوں کی ہوتی ہے۔ اس طرح کے ایک معاہدے میں مظلوم فریق کو حق پہنچتا ہے کہ اگر پورا معاہدہ ظالمانہ ہو تو موقع پاکر اسے ظالم کے منہ پر مار دے، اور اگر معاہدے کی کچھ شرطیں ناقابلِ برداشت ہوں تو انصاف کو ملحوظ رکھ کر ان میں مناسب ترمیم کر دے۔ یہ ایک مستقل اصول ہے جو قرآن کے اس فیصلے سے مستنبط ہوتا ہے۔

پس ہم اس معاملہ میں بالکل مطمئن ہیں کہ ایران اور مصر نے معاہدات کی یک طرفہ تنسیخ کا جو اقدام کیا ہے وہ بالکل درست ہے۔ یہ معاہدے ظالمانہ تھے اور اسی قابل تھے کہ انہیں فسخ کر دیا جائے۔

شمالی افریقہ، مصر، ایران اور دوسرے تمام مسلم ممالک میں برطانیہ، امریکہ اور فرانس نے جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے اس سے ہم کو یہ قوی اندیشہ ہے کہ اگر اس کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا تو آخر کار یہ پالیسی ان تمام ملکوں کو کمیونزم کی طرف دھکیل دیگی اور اس کے نتائج ساری دنیا کے لیے بھی خطرناک ہونگے اور خود ان مسلمان ملکوں کے لیے بھی۔ خدا کرے کہ ان ظالم قوموں کی آنکھیں کھل جائیں اور انہیں جلدی محسوس ہو جائے کہ اس نازک موقعہ پر یہ کیسی سخت غلطی کر رہی ہیں۔ اگر مسلمان ملک اپنے حق کے سوا کچھ اور مانگ رہے ہوتے تو البتہ یہ ایک بیجا بات ہوتی اور اسے رد کر دینے میں مغربی قومیں حق بجانب ہوتیں۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا ہے۔ حق والے اپنا حق مانگتے ہیں اور اسے طاقت کے بل پر ٹھکرایا جاتا ہے۔ اپنی جہانگیرانہ اغراض کے لیے نت نئی پالیسیاں بنائی جاتی ہیں اور زبردستی ان کو دوسروں پر ٹھونسا جاتا ہے۔ عرب ملکوں کے سینے میں اسرائیل کا خنجر بھونکا جاتا ہے۔ سویز کے راستے پر قابض رہنے کے لیے اصرار کیا جاتا ہے۔ ایران کے پٹرول کو چھوڑنے سے انکار کیا جاتا ہے۔ الجیریا، مراکش اور ٹیونس پر فرانس بدستور اپنا قبضہ جمائے رکھنا چاہتا ہے۔ ان حرکات کو آخر کون جائز ثابت کر سکتا ہے؟

ان پر اصرار کرنے کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ آپ ان ملکوں کو زبردستی دھکیل دھکیل کر روس کی گود میں پھینکنا چاہتے ہیں۔ جس رفتار سے ان ملکوں میں کمیونزم کا زور بڑھ رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک امریکہ اور انگلستان کی ظالمانہ پالیسی نہ بدلے گی مسلمانوں کی کمیونزم سے طبعی بیزاری اور مسلم ممالک کی اسلامی تحریکات کے باوجود اس سیلاب کو نہ روکا جا سکے گا۔ پس یہ وقت ہے کہ امریکہ اور انگلستان ہوش میں آئیں اور اپنا رویہ بدلیں۔ حکومت پاکستان سے ہم یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ان دونوں سلطنتوں کو اُن کی موجودہ پالیسی کے خطرناک نتائج پر صاف صاف متنبہ کرے اور انہیں اس سے باز آنے کا مشورہ دے۔ ہمارے محکمۂ خارجیہ کو انہیں سمجھانا چاہیے کہ تم اب زیادہ مدت تک مسلم ممالک کے سینے پر مونگ نہیں دل سکتے۔ اب تمہیں دو راستوں میں سے ایک کو لامحالہ انتخاب کرنا ہوگا۔ ایک راستہ یہ ہے کہ تم ان ملکوں کو راضی اور مطمئن کر کے ان کا دوستانہ تعاون حاصل کرو۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ان کو تنگ کر کر کے کمیونزم اور روس کی طرف دھکیل دو۔ تم خود ہی موازنہ کر کے دیکھ لو کہ ان دونوں میں سے کونسا راستہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

مسلم ممالک کے سلسلے میں ایک اور بات بھی ہے جس کے متعلق میں جماعت اسلامی کے نقطۂ نظر کو واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ خدا کے فضل سے اس وقت ان ملکوں میں متعدد ایسی تحریکیں چل رہی ہیں جن کا مقصد اسلام کا احیاء اور اسلامی نظامِ زندگی کی تجدید و ترویج ہے۔ ہم ایسی تمام تحریکات سے دلی ہمدردی رکھتے ہیں، سچے دل سے ان کی کامیابی کے خواہشمند ہیں، اور ہر اس تعاون کے لئے تیار ہیں جو ہمارے اور ان کے لئے ممکن ہو۔ اسی طرح ہم ان سے بھی یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے راستے میں وہ ہمارے ہمدرد اور مددگار بنیں۔ بخلاف اس کے ان ملکوں میں جتنی تحریکیں قوم پرستی پر مبنی ہیں، یا جن کا مقصد مغربی افکار و اطوار اور غیر اسلامی تہذیب و تمدن کو فروغ دینا ہے، ہم ان کے اسی طرح مخالف ہیں جس طرح خود اپنے ملک کی ایسی تحریکات کے مخالف ہیں۔

روس اور انگلو امریکن بلاک خارجی مسائل میں دوسری اہم چیز جو ہمارے لئے اور ساری دنیا

کے لئے جاذب توجہ بنی ہوئی ہے وہ اینگلو امریکن بلاک اور کمیونسٹ بلاک کی وہ عالمگیر کشمکش ہے جس نے دنیا بھر کو پھر ایک جنگ عظیم کے خطرے میں مبتلا کر دیا ہے میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہم اس کشمکش کے دونوں فریقوں میں سے کسی کو بھی حق بجانب نہیں سمجھتے ہمارے نزدیک دونوں یکساں فاسد و مفسد ہیں۔ ہماری ہمدردی ان میں سے کسی کے ساتھ بھی نہیں ہے، اور ہم چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اتنی طاقت عطا فرمائے کہ ہم ان دونوں بلاؤں سے بچ کر رہ سکیں۔ ہمیں ان میں سے کسی کے اندر بھی حق اور انصاف اور راستی کا شائبہ تک نظر نہیں آتا کہ اس پر ہم فریفتہ ہوں۔ ہمارے نزدیک حق کا تقاضا بھی یہی ہے اور ملک کی سلامتی بھی اسی میں ہے کہ ان کی کشمکش میں ہم غیر جانبدار، بلکہ اس سے بالکل بے تعلق رہیں تاہم اگر خدانخواستہ کبھی ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ ہمیں ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینی پڑی تو اس وقت شریعت کے قاعدے کے مطابق، اس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے ہم یہ رائے قائم کریں گے کہ ان دونوں بلاؤں میں سے کم تر درجہ کی بلا کونسی ہے۔ اس طرح کی ناگزیر صورت ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے قبل از وقت اس بارے میں کسی اظہار رائے کی ضرورت نہیں۔

مسئلہ کشمیر

اس کے بعد میں ایک ایسے مسئلہ پر اظہار رائے کروں گا جو ہمارے لئے بیک وقت داخلی بھی ہے اور خارجی بھی، اور پھر ہماری قومی زندگی کے لئے غیر معمولی اہمیت بھی رکھتا ہے۔ یہ ہے کشمیر کا معاملہ

اس معاملہ میں ہمارا نقطۂ نظر نہ وطن پرستانہ ہے نہ قوم پرستانہ ہم سارے معاملات کو سراسر حق پرستی کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور یہی ہمارا نقطۂ نظر کشمیر کے معاملہ میں بھی ہے۔ ہماری یہ قطعی رائے ہے کہ کشمیر پر قبضہ کرنے میں ہندوستان نے سراسر زیادتی کی ہے اور اس کے مقابلے

میں پاکستان کا دعویٰ بالکل حق بجانب ہے۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ ہندوستان نے کشمیر پر قبضہ اس وجہ سے نہیں کیا کہ وہ اس کا حق تھا بلکہ صرف اس وجہ سے کیا کہ تقسیم کے وقت پاکستان کمزور تھا اور ہندوستان اتنی طاقت رکھتا تھا کہ اپنے حق سے زائد ایک چیز حاصل کر لے ــــ میں اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ ہماری کمزوریوں کے ساتھ ہماری کوتاہیاں کیا تھیں۔ بہرحال یہ واقعہ اپنی جگہ بالکل عیاں ہے کہ اگر پاکستان نے اُس وقت کشمیر پر قبضہ کر لیا ہوتا تو کوئی معقول آدمی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ہندوستان بھی اُسی طرح کشمیر کا دعویٰ لے کر اُٹھتا جس طرح آج پاکستان اٹھا ہے اور وہ بھی پاکستان کی طرح یہ چیلنج کرتا کہ آؤ، کشمیر میں استصواب رائے عام کرا کے دیکھ لو۔ وہ خود جانتا ہے کہ ہندوستان و پاکستان کی تقسیم محض مذہب کی بنیاد پر ہوئی تھی۔ وہ خود جانتا ہے کہ وہی علاقے پاکستان بنائے گئے جہاں مسلمان اکثریت میں تھے اور وہی علاقے ہندوستان میں شامل کیے گئے جن میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ وہ خود جانتا ہے کہ تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے دوران میں جو کشت و خون ہوا، جو قتل عام ہوا، جو لوٹ مار ہوئی وہ سراسر اس بنیاد پر ہوئی کہ ہندوؤں اور سکھوں کے نزدیک ہر مسلمان کشتنی تھا اور مسلمانوں کے نزدیک ہر ہندو اور سکھ گردن زدنی تھا۔ ان ساری باتوں کو جانتے ہوئے کون یہ مان سکتا ہے کہ کشمیر جیسے مسلم اکثریت کے علاقے کو ہندوستان واقعی ایمانداری کے ساتھ اپنا حق سمجھتا تھا، اور اگر پاکستان اُس پر قابض ہو گیا ہوتا تو وہ بھی یہ دعویٰ کرنے کی جرأت کر سکتا تھا کہ استصواب رائے کرا کر دیکھ لیا جائے، کشمیر کے باشندے ہندوستان سے الحاق کے حق میں رائے دیں گے۔ پس یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے جسے ایک ہٹ دھرم آدمی کے سوا کوئی جھٹلا نہیں سکتا کہ کشمیر پر ہندوستان کا قبضہ حق کی بنیاد پر نہیں ہوا بلکہ سراسر طاقت کی دھاندلی سے ہوا ہے۔ اور اس معاملہ کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ہندوستان نے یہ صریح بے شرمانہ دھاندلی اُس زمانہ میں کی جبکہ گاندھی جیسا اخلاق کا علمبردار وہاں موجود تھا، اور اُس شخص کے ہاتھوں کی جو انگریزوں کی غلامی کے دور میں سیاست کو طاقت کے بجائے

اخلاق پر قائم کرنے کا سب سے زیادہ بلند بانگ مدعی بنا ہوا تھا، یعنی پنڈت جواہر لال نہرو۔ کشمیر اور جوناگڑھ کے معاملہ میں ہندوستان نے بیک وقت جو دو مختلف پالیسیاں اختیار کی ہیں، پنڈت نہرو کے سوا اور کون آدمی ایسا ہوگا جو عقل رکھتے ہوئے ان دونوں پالیسیوں کو متضاد ماننے سے انکار کر سکے؟ ایک جگہ آپ اس بنیاد پر قبضہ کرتے ہیں کہ وہاں کا حکمراں چاہے مسلمان ہو مگر آبادی کی اکثریت ہندو ہے۔ دوسری جگہ آپ اس بنیاد پر قبضہ کر لیتے ہیں کہ وہاں کی آبادی کی اکثریت چاہے مسلمان ہو مگر حکمراں ہندو ہے۔ ایک جگہ کا حکمراں پاکستان سے الحاق کا اعلان کرتا ہے تو آپ اسے اس لیے ماننے سے انکار کرتے ہیں کہ حکمراں نے الحاق کا فیصلہ باشندوں کی رضامندی حاصل کیے بغیر کر دیا ہے۔ دوسری جگہ کا حکمراں ٹھیک اسی طرح باشندوں کی رضامندی حاصل کیے بغیر ہندوستان سے الحاق کا اعلان کرتا ہے تو آپ اسے فوراً قبول کر لیتے ہیں اور اس الحاق کی دستاویز کو ایک سراسر آئینی دستاویز سمجھ کر دانتوں سے پکڑ لیتے ہیں۔ ایک جگہ آپ کے نزدیک اپنے علاقے کی قسمت کا فیصلہ کرنا باشندوں کا کام ہے اور حکمراں کا فیصلہ بالکل بے معنی ہے، کیونکہ وہاں کے باشندوں کی اکثریت ہندو اور حکمراں مسلمان ہے۔ دوسری جگہ اس کے بالکل برعکس حکمراں کا فیصلہ آپ کے نزدیک بالکل بامعنی اور سو فی صدی قانونی ہے اور اس کو تسلیم کرنے کے لیے باشندوں کی مرضی معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ وہاں حکمراں ہندو ہے اور باشندوں کی اکثریت مسلمان۔ کیا یہ کھلا ہوا تضاد نہیں ہے؟ یہ حرکتیں ایک ایسے سیاسی لیڈر کے سوا اور کون کر سکتا ہے جو حق اور انصاف اور راستی کے بجائے قوت اور زور کی بنا پر اپنی پالیسی بناتا ہو اور بالکل ایک ابن الوقت (Opportunist) کی طرح ہر موقع کے لیے ایک نیا اصول گھڑ لیتا ہو؟ واقعہ یہ ہے کہ پنڈت نہرو نے اپنے اس طرزِ عمل سے اپنی اُس ساری عزت و وقعت کو خاک میں ملا دیا ہے جو انہوں نے عمر بھر سیاست میں اخلاق کی علمبرداری کر کے حاصل کی تھی۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہ بھی ظاہر کر دوں کہ ہماری نگاہ میں کشمیر

کے معاملہ کی اصل اہمیت اور غیر معمولی اہمیت کس وجہ سے ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے ملک کے لیے ایک وسیع علاقہ حاصل کرنا چاہتے ہیں، یا اپنے ملک کی معیشت کے لیے کشمیر کو ناگزیر پاتے ہیں۔ یہ ایک قوم پرست اور وطن پرست کا نقطۂ نظر تو ہو سکتا ہے مگر ایک حق پرست کا نقطۂ نظر نہیں ہو سکتا۔ ہمارے لیے اس معاملہ کی ساری اہمیت صرف اس وجہ سے ہے کہ کشمیر کے ۳۰-۳۵ لاکھ مسلمانوں کا مستقبل ہم کو خطرے میں نظر آرہا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ جموں کے علاقے سے بکثرت مسلمان نکالے جا چکے ہیں؟ کس کو معلوم نہیں ہے کہ پٹھانکوٹ سے دتی تک کا علاقہ مسلمانوں سے خالی ہو چکا ہے؟ کس سے یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ ہندوستان نے قصداً ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت اپنے اُن تمام علاقوں کو مسلمانوں سے خالی کرایا ہے جو مغربی پاکستان کی سرحد سے متصل واقع ہیں اور اب اسی پالیسی پر مشرقی پاکستان کی طرف بھی عمل ہو رہا ہے؟ اس کو دیکھتے ہوئے کبھی یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ اگر کشمیر کی قسمت کا آخری فیصلہ ہندوستان کے حق میں ہو گیا تو وہ زیادہ مدت تک اپنے انتہائی شمالی سرے پر ایک مسلم اکثریت کے علاقے کو برداشت کرتا رہے گا۔ کبھی نہ کبھی وہ وقت ضرور آئیگا جب کشمیر کی ساری مسلمان آبادی، مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی طرح گھروں سے نکالی جائیگی اور مار مار کر اس کو بیک بینی و دو گوش پاکستان کی طرف دھکیل دیا جائیگا۔ آج کشمیریوں کی جو مدارات ہندوستان میں ہو رہی ہے یہ ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہے۔ یہ سب کچھ تو بس اسی وقت تک ہے جب تک کشمیر کا قضیہ معلق ہے۔ اس کے یکسو ہو جانے کے بعد یہ ہرگز امید نہیں کی جا سکتی کہ ہندوستان اس مسلم اکثریت کو پاکستان کے قریب یوں اطمینان سے بیٹھا رہنے دیگا۔ اس لیے اُن لاکھوں انسانوں کی خاطر جو کشمیر میں بستے ہیں، ان کی جان اور مال اور آبرو کی خاطر، اور ان کے پیدائشی انسانی حقوق کی خاطر ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ انہیں ہندوستان کے چنگل سے نکالا جائے، اور ہم صاف کہتے ہیں کہ اس مقصد کے لیے ہم آخری حد تک جانے کو تیار ہیں۔

داخلی مسائل

دینی حالت | خارجی مسائل کے بعد اب میں ملک کے داخلی حالات پر ایک مختصر تبصرہ کرونگا

دوسرے تمام معاملات سے بڑھ کر جو چیز ہمارے لیے اہمیت رکھتی ہے وہ ہماری قوم کی دینی حالت ہے۔ اس حالت کا جب ہم جائزہ لیکر دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ دینی حیثیت سے ہم مسلسل انحطاط کی طرف جا رہے ہیں اور پاکستان بننے کے بعد یہ رفتار انحطاط کم ہونے کے بجائے کچھ اور زیادہ تیز ہوگئی ہے۔ یہ ہمارے نزدیک خطرہ نمبر ۱ ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری آبادی کا بڑا حصہ ــــ بہت بڑا حصہ ــــ احکام الٰہی سے بُعد رکھتا ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ملک میں علانیہ خدا کے احکام کی خلاف ورزی ہو رہی ہے اور ایسے نازک وقت میں بھی لوگ اُس سے باز نہیں آتے جبکہ ہم اپنے آپ کو چاروں طرف سے خطرات میں گھرا ہوا پاتے ہیں اور خدا سے نصرت مانگ رہے ہوتے ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ملک میں فرنگیت اور فسق و فجور کی رَو بڑھتی چلی جا رہی ہے اور آج وہ کچھ ہو رہا ہے جو انگریز کے زمانے میں بھی نہ ہوتا تھا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلام آج بھی اسی طرح بے بس ہے جس طرح انگریز کے زمانہ میں تھا۔ بلکہ اس کے اصول اور قوانین اور احکام اُس وقت سے کچھ زیادہ پامال کیے جا رہے ہیں، جرأت اور جسارت کے ساتھ کیے جا رہے ہیں، کھلم کھلا کیے جا رہے ہیں، بڑے پیمانے پر کیے جا رہے ہیں، ان کے خلاف چلنے کی علانیہ تبلیغ ہو رہی ہے، اور عوام الناس کو ان کے خلاف چلانے کی منظم کوششیں کی جا رہی ہیں۔

اس کے سب سے زیادہ افسوسناک پہلو دو ہیں۔ ایک یہ کہ سرکاری ملازمتوں سے، فوج اور سول دونوں قسم کی ملازمتوں سے، اُن لوگوں کو چُن چُن کر نکالا جا رہا ہے جن کے اندر ایمان اور دینداری کی کچھ بھی رمق پائی جاتی ہے۔ اس طرح حکومت کی مشینری روز بروز اسلامی

رجحانات رکھنے والے عناصر سے خالی ہوتی جا رہی ہے اور اُس پر کمیونسٹ اور دوسرے مخالف دین عناصر قابض ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ قومیت کی اِس تبلیغ اور اس کو رواج دینے کی اِس منظم کوشش کا نشانہ خاص طور پر ہماری عورتیں بنائی جا رہی ہیں۔ زور لگایا جا رہا ہے کہ اسلامی تہذیب و اخلاق کے اُس آخری حصار کو بھی توڑ دیا جائے جہاں ہر طرف سے پسپا ہو کر اُس نے پناہ لی تھی۔ طرح طرح سے تدبیریں کی جا رہی ہیں کہ اُس گہوارے کو بھی گندہ کر کے رکھ دیا جائے جہاں ایک مسلمان بچہ سب سے پہلے آنکھ کھولتا ہے اور جہاں اسے مذہب، اخلاق، آدمیت، اور اجتماعی برتاؤ کا پہلا سبق ملتا ہے۔

یہ سب کچھ اُن مقاصد کے بالکل خلاف ہے جن کا نام لیکر پاکستان مانگا گیا تھا اور جن کے اظہار و اعلان ہی کے طفیل اللہ تعالیٰ نے یہ ملک ہمیں بخشا تھا۔ کہا یہ گیا تھا کہ ہمیں ایک خطۂ زمین اس لیے درکار ہے کہ اس میں ہم مسلمان کی سی زندگی بسر کر سکیں، اسلام کو پھر سے زندہ اور تازہ کر سکیں، اور اسلام کی بنیادوں پر خود اپنے ایک تمدن اور اپنی ایک تہذیب کی عمارت اٹھا سکیں۔ مگر جب خدا نے وہ خطہ دے دیا تو اب کیا یہ جا رہا ہے کہ اسلام کے رہے سہے آثار بھی مٹائے جا رہے ہیں اور اُس تہذیب و اخلاق و تمدن کی عمارت مکمل کی جا رہی ہے جس کی نیو یہاں انگریز رکھ گیا تھا۔

اس صورتِ حال کو ہم جس وجہ سے خطرہ نمبر ۱ سمجھتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ صریح طور پر خدا کے غضب کو دعوت دینے کی ہم معنی ہے۔ ہم ہرگز یہ توقع نہیں کر سکتے کہ اپنے رب کی کھلی کھلی نافرمانیاں کر کے ہم اُس کی رحمت اور نصرت کے مستحق بن سکیں گے۔

اس میں خطرے کا یہ پہلو بھی ہے کہ پاکستان کے عناصرِ ترکیبی میں نسل، زبان، جغرافیہ کوئی چیز بھی مشترک نہیں ہے۔ صرف ایک دین ہے جس نے اِن عناصر کو جوڑ کر ایک ملت بنایا ہے۔ دین کی جڑیں یہاں جتنی مضبوط ہونگی اتنا ہی پاکستان مضبوط ہوگا۔ اور وہ جتنی کمزور ہونگی اتنا ہی پاکستان کمزور ہوگا۔

اس میں خطرے کا پہلو یہ بھی ہے کہ یہ کیفیت ہمارے ہاں جتنی زیادہ بڑھے گی، ہماری قوم میں منافقت اور عقیدہ و عمل کے تضاد کی بیماری بڑھتی چلی جائیگی۔ یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے اندر اسلامی احکام کی خلاف ورزی پھیلا دینا جس قدر آسان ہے، اُن کے دلوں سے اسلامی عقائد کو نکال پھینکنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اب اگر صورت حال یہ ہو کہ مسلمان عقیدۃً فرض کو فرض، حلال کو حلال اور حرام کو حرام ہی سمجھتے رہیں مگر ان میں روز بروز ایسے افراد کی تعداد بڑھتی چلی جائے جو فرض کو فرض جانتے ہوئے ادا نہ کریں، حکم کو حکم مانتے ہوئے اس کی تعمیل نہ کریں، اور حرام کو حرام سمجھتے ہوئے اس میں خفیہ اور علانیہ مبتلا ہوں، تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی آبادی کو روز بروز زیادہ منافق بنا رہے ہیں، اس کے کیرکٹر کی بنیادیں ڈھیلی کر رہے ہیں، اس کے اندر سے فرض شناسی اور پابندی قانون کی جڑیں کاٹ رہے ہیں، اور اس کو یہ تربیت دے رہے ہیں کہ وہ اپنے اعتقاد کے خلاف عمل کرنے کی خوگر ہو جائے۔ کیا کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہ تپ دق کی بیماری جو ہماری مذہبی زندگی میں پھیلائی جا رہی ہے، صرف مذہب کے دائرے تک ہی محدود رہ جائے گی؟ ہماری پوری قومی عمارت کو کھوکھلا کر کے نہ رکھ دیگی؟ جو مسلمان خدا اور رسول کے ساتھ مخلص نہ رہے اُس سے آپ کیا توقع رکھتے ہیں کہ وہ قوم، وطن، ریاست اور کسی دوسری چیز کے لیے مخلص ثابت ہو سکے گا؟

اس میں خطرے کا یہ پہلو بھی ہے کہ غیر اسلامی اخلاق و اطوار کو رواج دینے کی کوششیں جتنی زیادہ بڑھ رہی ہیں، ملک کے دین پسند عناصر میں اُن کے مقابلے اور مزاحمت کا جذبہ بھی اتنا ہی زیادہ بڑھتا جا رہا ہے اور اس چیز نے ملک کو صریح طور پر دو کیمپوں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک اسلامی کیمپ اور دوسرا غیر اسلامی کیمپ۔ غور کرنے کی بات ہے کہ یہ وقت جبکہ ہماری نئی مملکت ابھی ابھی قائم ہوئی ہے آیا اس بات کا متقاضی تھا کہ ہم اس کی تعمیر و ترقی میں مل جل کر اپنی ساری قومی طاقت صرف کر دیتے، یا اس بات کا کہ ہم دو کیمپوں میں بٹ کر اپنی طاقتیں آپس کی کشمکش میں صرف کرتے؟ کچھ سوچیے کہ یہ کشمکش ہمیں

کدھر لے جا رہی ہے اور آخر کہاں پہنچا کر چھوڑے گی ؟

اخلاقی حالت | دین کے بعد ہماری نگاہ میں دوسری چیز جو سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، اخلاق ہے۔ اس حیثیت سے جب ہم ملک کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا عام اخلاقی انحطاط حقیقت میں ہمارے اس ملک کے لیے خطرہ نمبر ۲ ہے۔

ملک کے تمام طبقے کیرکٹر کے بودے پن اور بے ضمیری میں مبتلا ہیں۔ اخلاقی خرابیاں ایک وبا کی طرح پھیل رہی ہیں۔ تمام اخلاقی حدود توڑ کر رکھ دیگئی ہیں اور عام طور پر لوگوں کے دلوں سے یہ احساس مٹتا جا رہا ہے کہ اخلاق بھی کوئی چیز ہے جس کے تقاضوں کا کچھ لحاظ آدمی کو کرنا چاہیے۔ عوام ہوں یا تعلیم یافتہ حضرات، سرکاری افسر اور اہلکار ہوں یا سیاسی لیڈر اور پارٹیوں کے کارکن، اخبار نویس ہوں یا اہلِ قلم، تاجر ہوں یا اہلِ حرفہ، زمیندار ہوں یا کسان، جس طبقے کو دیکھیے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اخلاقی ذمہ داریوں کو بھول چکا ہے اور کسی ایسی حد سے واقف نہیں رہا ہے جس پر وہ اپنی اغراض و خواہشات کے پیچھے دوڑتے ہوئے رک جائے۔ ہر شخص اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے ہر بدتر سے بدتر ذریعہ اختیار کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ حرام اور حلال کی تمیز اُٹھ چکی ہے۔ گناہ اور صواب کا احساس مٹ گیا ہے۔ برائی اور بھلائی کے فرق سے نگاہیں بند کر لی گئی ہیں۔ لوگوں کے ضمیر نے ان کے ذاتی مفاد کے آگے سپر ڈال دی ہے۔ فرائض کو لوگ بھول چکے ہیں اور حقوق سب کو یاد ہیں۔ جھوٹ اور فریب اور چالبازی کام نکالنے کے مقبول ترین ہتھیار بن گئے ہیں۔ رشوت اور خیانت اور حرام خوری کے دوسرے ذرائع شیرِ مادر کی طرح حلال ہو گئے ہیں۔ مال والوں کے مال ضمیروں اور عصمتوں اور شرافتوں کو خریدنے میں صرف ہو رہے ہیں اور بیچنے والے دھڑلے سے اخلاق کے وہ سارے جوہر بیچ رہے ہیں جو ان کی نگاہ میں روپے سے کم قیمت رکھتے ہیں۔

میں اس کو اس ملک کے لیے خطرۂ عظیم سمجھتا ہوں۔ کیرکٹر ہی وہ اصل طاقت ہے جس کے بل پر کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہے اور ترقی کر سکتی ہے۔ اگر اس طاقت سے ہم محروم ہو جائیں، اگر ہمارے اخلاق کی جان نکل جائے اور ہم بالکل حدود سے ناآشنا ہو کر رہ جائیں تو ترقی کرنا تو

درکنار ہم ایک آزاد قوم کی حیثیت سے زندہ بھی نہیں رہ سکتے

تعلیمی حالت اب ذرا تعلیمی حالت کو دیکھیے۔ دین اور اخلاق کے بعد میرے نزدیک تعلیم کی اہمیت دوسری سب چیزوں سے زیادہ ہے، کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو نئی نسلوں کو بناتی ہے اور اسی پر ایک قوم کے مستقبل کا انحصار ہوتا ہے۔ اگر موجودہ نسل بہتر سے بہتر بھی ہو، زیادہ سے زیادہ قابلیتوں کی مالک بھی ہو تو اس کی خوبیاں بس اپنے ہی دور کی خدمت کر سکیں گی۔ قوم کا مستقبل بہرحال آنے والی نسلوں ہی کے ہاتھ میں رہیگا۔ اور وہ ان نسلوں کو اچھی تعلیم ملنے سے روشن، اور بُری تعلیم ملنے سے تاریک ہوگا۔

تعلیم کی اس اہمیت کو نگاہ میں رکھ کر جب ہم حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ دیکھ کر ہمارا دل بیٹھ جاتا ہے کہ ہمارے ملک میں تعلیم کا معیار روز بروز پست ہوتا جا رہا ہے جیسی کچھ بری بھلی تعلیم انگریز کے زمانے میں تھی آج وہ اس معیار پر بھی برقرار نہیں رہی۔ جو لوگ مدارس میں بچوں کو بھیجتے ہیں اور جو لوگ خود تعلیم گاہوں میں کام کر رہے ہیں، دونوں سے پوچھ کر دیکھ لیجیے، کوئی بھی موجودہ تعلیمی حالت سے مطمئن نہیں ہے۔ شاید ہی کوئی شخص ہمارے درمیان ایسا پایا جاتا ہو جو اس صورت حال کو خطرے اور تشویش کی نگاہ سے نہ دیکھ رہا ہو۔

پھر اسلامی نقطۂ نظر سے تعلیم کے معاملہ میں انگریز کے زمانے کی بہ نسبت آج کوئی قابل لحاظ تغیر واقع نہیں ہوا ہے۔ جو کچھ ہماری نئی نسلوں کو انگریز بنا رہا تھا وہی کچھ آج ہم خود بنا رہے ہیں۔ وہی فلسفۂ زندگی، وہی فکر و نظر، وہی خیالات، وہی ذہنیتیں، وہی قدریں، اور وہی علم و عقل کے سانچے۔ کوئی چیز بھی اس وقت سے آج تک نہیں بدلی ہے۔ حالانکہ پہلے اس بات کا فیصلہ کہ ہماری آئندہ نسلوں کو کیا بننا چاہیے، غیروں کے ہاتھ میں تھا، اور آج خود ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اس سے بڑھ کر ہماری بدقسمتی اور نادانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو تعلیمی اسکیم ہمارے اخلاق و تمدن اور ہماری تہذیب کی جڑیں کاٹنے کے لیے غیروں نے بنائی تھی وہ اب خود ہمارے اپنے ہاتھوں عمل میں آ رہی ہے۔ پھر ہم دیکھ رہے ہیں کہ اخلاقی تربیت سے ہمارا نظام تعلیم بالکل خالی ہے۔ ہم کتابیں تو پڑھا

رہے ہیں مگر انسان نہیں بنا رہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر کسی کو انسان نہ بنایا جائے، اخلاق کی تربیت دے کر اس کے اندر پاکیزہ جذبات، شریفانہ تخیلات، اور عمدہ خصائل نہ پیدا کئے جائیں۔ اس کو اصول کی پابندی اور اخلاقی حدود کی نگہداشت نہ سکھائی جائے، تو تعلیم پاکر وہ سوسائٹی کے لیے ایک مفید رکن بننے کے بجائے اُلٹا ایک خطرناک عنصر بن جائے گا۔ مثلاً آپ ایک شخص کو ڈاکٹر بناتے ہیں مگر اسے انسان نہیں بناتے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ ہزاروں بندگانِ خدا کی جانوں سے کھیلے اور لوگوں کی صحتیں اور ان کی زندگیاں اس شخص کے لیے محض روپیہ بنانے کے وسائل بن کر رہ جائیں۔ یا مثلاً ایک شخص قانون پڑھ کر آپ کی درس گاہوں سے نکلتا ہے مگر انسانیت کا سبق سیکھ کر نہیں آتا۔ ظاہر ہے کہ ایسا قانون داں اگر وکیل بنے گا تو قانون کو جرائم پیشہ لوگوں کا کھلونا بنائے گا اور جج بنے گا تو عدل کے بجائے ظلم کریگا۔ یہ آخر انسانیت کے بغیر صرف کتابی تعلیم پائے ہوئے لوگ ہی تو ہیں جو آج سرکاری محکموں میں بیٹھے رشوت خواریاں، حق تلفیاں اور ہر طرح کی بے ایمانیاں کر رہے ہیں، جو تجارت میں بلیک مارکٹنگ اور دوسری بددیانتیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں، جو صحافت میں ضمیر فروشی کی بدترین مثالیں پیش کر رہے ہیں، اور جن کی اخلاقی خرابیوں سے آج ہماری اجتماعی زندگی کا ہر شعبہ گندگیوں سے آلودہ ہو رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو تعلیم اخلاقی تربیت سے خالی ہو وہ ایک قوم کے لیے نفع سے بڑھ کر مضرت کے پہلو رکھتی ہے۔

یہ تعلیمی حالت ہمارے لیے خطرہ نمبر ۳ ہے۔

انتظامی حالت اس کے بعد جب ہم ملک کے انتظام پر نگاہ ڈالتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ ہر پہلو میں انگریزی دور کے معیار سے گر گیا ہے اور اس تیزی سے گرتا جا رہا ہے کہ وہ خطرے کی حد قریب آ لگی ہے جہاں پہنچ کر ایک ملک کا نظم و نسق تاشے کی طرح بیٹھ جاتا ہے۔ انگریز کے زمانے میں سرکاری محکموں کے ڈسپلن، کارکردگی، اور سرکاری ملازمین کی فرض شناسی کا جو حال تھا، آج اس کا ۲۵ فی صدی بھی نہیں ہے۔ البتہ رشوت، دوست نوازی، اقربا پروری،

خیانت، غبن اور سی و سفارش کی کارفرمائی میں سو فی صدی اضافہ ہو گیا ہے۔ انصاف کا حال یہ ہے کہ عوام الناس نہ تو عدالتوں سے اس کی امید رکھتے ہیں اور نہ انتظامی عہدہ داروں سے۔ عام احساس یہ ہے کہ آدمی کو جو کچھ مل سکتا ہے یا روپے سے مل سکتا ہے یا کسی با اثر آدمی کی قرابتداری یا سفارش سے۔ یہ دونوں چیزیں ہوں تو آدمی اپنی ناجائز اغراض بھی حاصل کر سکتا ہے، اور یہ نہ ہوں تو اس کے جائز حقوق بھی ملنے مشکل ہیں۔ بڑے افسروں سے لے کر چھوٹے کارکن تک بالعموم اس قدر خود غرض، نافرض شناس، اور بیباک ہو چکے ہیں کہ اپنے ذرا سے فائدے کے لیے قوم اور ریاست کا بڑے سے بڑا نقصان کر دینے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ حق اور انصاف اُن کے لیے بے معنی الفاظ بن گئے ہیں۔ ڈیوٹی کی انہیں کوئی پروا نہیں رہی ہے۔

اس سلسلے میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے میں آپ کو اُس رپورٹ کی طرف توجہ دلاؤں گا جس کے اقتباسات ابھی ابھی ۴ نومبر کے "ڈان" میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ رپورٹ پنجاب کے نظم و نسق سے متعلق ہے اور وزیر اعظم پنجاب کے پارلیمنٹری سکرٹری، ملک قادر بخش صاحب نے اسے مرتب کیا ہے۔ اس کے چند فقرے یہ ہیں:-

"متعدد اضلاع میں انتظامی حالت بالکل ناگفتہ بہ ہے۔ معاملات میں بروقت کارروائی لگے زمانے کی ایک داستان بن گئی ہے جس سے آج کے سرکاری ملازمین ناآشنا ہیں۔ ہر محکمے میں رشوت کا بازار گرم ہے۔ اقربا نوازی، دوست پروری، بے پروائی اور نکمّا پن ایسے عیوب ہیں جن کا آئے دن مشاہدہ ہوتا رہتا ہے۔"

"درخواست گذاروں کو کسی سرکاری محکمے میں درخواست دینے کے بعد کچھ پتہ نہیں چلتا کہ ان کی درخواست کہاں ہے اور اس کا کیا بنا۔ انکی درخواستوں کا کوئی نتیجہ برآمد ہونے کی بس ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ برابر اہل کاروں کی مٹھی گرم کرتے رہیں۔"

"میں نے سرگودھا اور منٹگمری کے دفتر آبادکاری کا معائنہ کیا۔ ان کی بے ترتیبی

کا یہ حال تھا کہ وہ دفتر کے بجائے کباڑیے کی دوکان معلوم ہوتے تھے۔"

"ایک بڑا قیمتی خزانہ جو سابق غیر ملکی حکمراں ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں وہ مالگزاری اور دوسرے محکموں کے سرکاری ریکارڈ ہیں جن کے بغیر کوئی نظمِ حکومت باقاعدگی کے ساتھ نہیں چلایا جا سکتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ تین چار سال کی مختصر مدت ہی میں ان کا حال نہایت ابتر ہو چکا ہے۔ (اس سلسلہ میں ملک صاحب نے متعدد مثالیں ایسی دی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کاغذاتِ مال میں جھوٹے اندراجات کرنے اور جعلی دستاویزیں شامل کر دینے کا بھی طریقہ چل پڑا ہے)۔"

"اضلاع میں مجھے یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا کہ مجسٹریٹ احساس کہتری میں مبتلا ہیں ..... بدقسمتی سے نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ مجسٹریٹ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ وہ اپنے علاقہ کی پولیس پر کوئی قابو نہیں رکھتے۔ ایک زمانہ تھا جبکہ ضلع کے پولیس افسر اپنے آپ کو علاقہ مجسٹریٹ کے ماتحت امن و امان کے قیام کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ مگر اب مجسٹریٹوں کے اندر یہ احساس عام ہے کہ آج پولیس ہر وقت خود اُن کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔"

"مجھے یہ کہنا چاہیے کہ آدمی کے لیے ایک جنگل میں زندگی گزارنا اس سے بہتر ہے کہ وہ ایک ایسی متمدن سوسائٹی میں زندگی بسر کرے جہاں وہ بے لاگ انصاف کی نہ عدالتوں سے توقع رکھتا ہو اور نہ انتظامی حکام سے۔ لوگوں کے دلوں میں سو فی صدی یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ وہ کسی با اثر سفارش کے بغیر کہیں سے بھی انصاف نہیں پا سکتے۔"

یہ ہے پنجاب کی صورتِ حال جو ایک سرکاری رپورٹ میں تسلیم کی گئی ہے۔ اور میں معتبر معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مغربی پاکستان کے دوسرے صوبوں کا حال اس معاملہ میں پنجاب سے بدرجہا زیادہ بدتر ہے۔ مشرقی پاکستان کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا، کیونکہ وہاں کے حالات کا براہِ راست مشاہدہ کرنے کا موقع مجھے ابھی تک نہیں ملا ہے۔

[اس موقع پر حاضرین میں سے ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ آپ پنجاب کی جس رپورٹ کا حوالہ دے رہے ہیں اس کی سرکاری طور پر تردید ہو چکی ہے۔ اس کے جواب میں مقرر نے کہا:]

مجھے معلوم ہے کہ اس رپورٹ کی تردید میں حکومت پنجاب کی طرف سے ایک بیان شائع ہوا ہے۔ میں نے اس بیان کو پڑھا ہے۔ اس میں تردید تو صرف ایک دو واقعات ہی کی کی گئی ہے۔ باقی سارا بیان جو کچھ ظاہر کرتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ حکومت پنجاب اس رپورٹ کا راز فاش ہونے سے سخت پریشان ہوئی ہے اور بھونڈے طریقے سے کچھ لیپ پوت کرنا چاہتی ہے۔ یہ بھی ایک افسوسناک بات ہے کہ حقائق کو صاف صاف تسلیم کرنے اور ان کا علاج کرنے کے بجائے ان سے آنکھیں بند کر لینے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جو بیماری فی الواقع ہمارے جسم میں موجود ہے اور ہمیں اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے، کیا وہ محض اتنی بات سے دور ہو جائے گی کہ آپ نے اس کی موجودگی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا؟

میں نے ملک قادر بخش صاحب کی رپورٹ کا جو حوالہ دیا ہے اس سے شاید معترض کو یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ نظم و نسق کی خرابیوں کے متعلق میرا ذریعۂ معلومات صرف یہی ایک رپورٹ ہے اور شاید اسی رپورٹ کی بنیاد پر میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ملک کا نظم و نسق بگڑ رہا ہے۔ حالانکہ میں نے اس رپورٹ کو یہاں اس حیثیت سے پیش نہیں کیا ہے کہ یہ ان حالات کی موجودگی کا ثبوت ہے بلکہ صرف اس حیثیت سے پیش کیا ہے کہ اب یہ واقعات عالم بالا میں بھی تسلیم کر لیے گئے ہیں۔ اگر بالفرض اس رپورٹ کی سرکاری طور پر تردید ہو گئی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ واقعات حقیقت میں واقعات نہیں رہے، بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ بڑی سرکاروں کو اب تک ان کے موجود ہونے سے انکار ہے۔ رہے واقعات، تو وہ تو روز روشن میں موجود ہیں۔ ہر وقت، ہر جگہ، پبلک کے ہر آدمی کو ان سے سابقہ پیش آ رہا ہے۔ جب چاہیے، جس شہر، جس محلے، جس بستی، جس گاؤں میں چاہیے، عام آدمیوں کے درمیان چل پھر کر پوچھ لیجیے کہ عدالتوں اور سرکاری محکموں اور سرکاری افسروں سے جب کبھی انہیں معاملہ پڑتا ہے تو وہ کن حالات سے دوچار ہوتے ہیں۔ حکومت کے بڑے بڑے ذمہ دار عہدہ داروں سے پوچھ دیکھیے کہ وہ انگریزی دور کی بہ نسبت آج اپنے محکموں میں

ڈسپلن کا انکار کر دگی کا، فرض شناسی اور دیانت کا کیا حال پاتے ہیں۔ اگر ان باتوں سے کسی کو انکار ہے تو میں چیلنج کرتا ہوں کہ نظم و نسق کی حالت کا جائزہ لینے کے لیے ایک کھلی پبلک تحقیقات کرا لی جائے معلوم ہو جائیگا کہ حالات ملک قادر بخش کی رپورٹ سے بدتر ہیں یا بہتر؟

لیکن ہمارا فرض صرف اسی بات پر ختم نہیں ہو جاتا کہ ہم نظم و نسق کے بگڑنے اور خطرناک حد تک بگڑ جانے کی شکایت کریں۔ ہمیں اس سوال پر بھی غور کرنا چاہیے کہ چار سوا چار سال کے اندر حکومت کے انتظام میں اتنا بگاڑ آخر پیدا کیسے ہو گیا؟ کیا بات ہے کہ وہی ملازمین جو کل ایک غیر ملکی اقتدار کی خدمت نسبتہً زیادہ محنت، زیادہ فرض شناسی اور زیادہ دیانت سے کر رہے تھے، آج وہ خود اپنی قومی حکومت کی خدمت کرنے میں اس سے آدھی قابلیت اور ایمانداری سے بھی کام نہیں لے رہے؟ کیا وجہ ہے کہ جو ملازمین ہندوؤں کے مقابلے میں پاکستان زندہ باد پکارتے تھے اور پاکستان کے عشق میں دیوانے ہو رہے تھے آج اسی محبوب و مطلوب پاکستان کو پا لینے کے بعد وہ اس کی جڑیں کاٹنے لگے ہیں؟ ——

میں نے اس سوال پر مدتوں غور کیا ہے اور اس کو سمجھنے کے لیے حالات کی تحقیق کی ہے۔ میں صاف کہتا ہوں کہ سب سے بڑھ کر اس صورت حال کی ذمہ داری اُس پارٹی پر اور اُس کے لیڈروں اور کارپردازوں پر عائد ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں قیام پاکستان کے بعد اقتدار کی باگ ڈور آئی۔ ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ پورا ملک ایک متروکہ جائداد ہے جو براہِ راست ان کو الاٹ ہوئی ہے۔ انہوں نے سرکاری ملازموں کو اپنا اور اپنے خاندانوں اور دوستوں کا ملازم اور اپنی پارٹی کا والنٹیر بنا لیا انہوں نے اپنی اغراض کے لیے ہر شعبۂ حکومت کے کارکنوں کو استعمال کرنا شروع کیا اور پھر انتخابات میں یہ خدمت بھی انہی کے سپرد کی کہ وہ ان کو اور انکی پارٹی والوں کو کامیاب کرانے کے لیے ہر طرح کی دھونس اور دھاندلی سے کام لیں۔ اس کے بعد آپ یہ کیسے امید کر سکتے ہیں کہ جو اربابِ اقتدار خود سرکاری ملازمین سے غیر آئینی طریقے پر کام لیتے ہوں ان کے ماتحت ملازمین کسی ڈسپلن، کسی ضابطے اور کسی آئینِ عدل و دیانت کے پابند رہ سکیں گے؟ اس طرح کے اربابِ اقتدار تو مجبور ہیں کہ اپنا کام لینے کے بعد ان افسروں اور اہل کاروں کو رشوت، خیانت، ڈیوٹی سے گریز اور ضابطے کی خلاف ورزی

کے لیے پوری ڈھیل دے دیں۔ کیونکہ یہ ڈھیل دیے بغیر وہ اُن سے اپنی اغراض کی خدمت نہیں لے سکتے۔ نظم اور آئین کی پابندی ہوگی تو ہر معاملے میں ہوگی اور سب سے پہلے اُن لوگوں کو کرنی پڑے گی جن کے ہاتھ میں زمامِ کار ہو۔ ورنہ یہ ممکن نہیں ہے کہ وزیروں اور ان کی پارٹی کے ممبروں کے لیے تو آئین و ضابطہ رات دن توڑا جائے اور باقی سارے معاملات میں اس کی پوری پابندی ہوتی رہے۔

معاشی حالت اب میں ملک کی معاشی حالت کا جائزہ لوں گا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ہمارے ملک کا پورا معاشی نظام بے انصافی پر مبنی ہے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ بے انصافی اس معاشی نظام کی بنیاد آج بنی ہے۔ نہیں، پہلے سے چلی آرہی ہے لیکن قیامِ پاکستان کے بعد سے اب تک اس میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہے، کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ یہاں جو زور آور ہے، ذرائع اور وسائل رکھتا ہے، اُس کے لیے ترقی اور خوشحالی کی، بلکہ عیش و عشرت کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ مگر جو کمزور اور بے وسیلہ ہے اس کے لیے جینا تک مشکل ہے، عزت کے ساتھ جینا تو دُور کی چیز ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک کے بااثر اور بااختیار لوگ غریبوں سے ہمدردی کی باتیں بہت کرتے ہیں، مگر عمل کا جائزہ لینے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ غریبوں کے جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے سوا ان باتوں کا کوئی اور مقصد نہیں ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال وہ زرعی اصلاحات ہیں، جن کا ڈھول ایک مدت سے پیٹا جا رہا ہے۔ بظاہر ان کا مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ زمین کے معاملہ میں انصاف قائم کیا جائے۔ مگر ذرا گہری نظر سے جائزہ لیجیے تو صاف پتہ چل جاتا ہے کہ اس پوری اسکیم کی بنیاد "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے اصول پر ہے۔ کوشش یہ کی جا رہی ہے کہ مالکانِ زمین اور کاشتکاروں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑایا جائے اور ہر ایک کو دوسرے کے خلاف ہوا بنا کر دونوں کو مجبور کیا جائے کہ وہ برسرِ اقتدار گروہ کی شطرنج کے مہرے بن کر رہیں۔ اس طرح راستبازی کے ساتھ حقیقی انصاف قائم کرنے کے بجائے ملک میں ایک خوفناک طبقاتی کشمکش کی آگ بھڑکائی جا رہی ہے جو بہت ممکن ہے کہ تھوڑی ہی مدت بعد خود ان کے قابو میں بھی نہ رہے اور ان کی اغراض

کے بجائے اشتراکیوں کی اغراض کے لیے مفید ثابت ہو۔

مالیات کے معاملہ میں جب ہم اپنی مملکت کی پالیسی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو وہ ہر لحاظ سے غلط نظر آتی ہے ٹیکسوں کا جتنا بوجھ پبلک پر ڈالا گیا ہے اس میں انصاف ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ غریب طبقوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بار ڈالا گیا ہے اور امیر طبقوں پر ان کی طاقت سے کم، حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیے تھا۔ پھر ٹیکس لگانے اور وصول کرنے کے طریقوں میں کچھ ایسی خرابیاں پائی جاتی ہیں جو ملک کی رہی سہی اخلاقی حالت کو بھی برباد کر رہی ہیں۔ ان کی بدولت ہماری محصول گزار آبادی روز بروز زیادہ جھوٹی اور بددیانت بنتی جا رہی ہے۔ جعلی رجسٹر رکھنا، جھوٹے حسابات پیش کرنا، جھوٹے حلفیہ بیانات دینا، اور رشوتیں دے دے کر اپنے اوپر سے ٹیکسوں کا بوجھ ہلکا کرنا، روزمرہ کا معمول بن گیا ہے اور حالات کچھ ایسے ہو چکے ہیں کہ ہماری سوسائٹی میں جو ایک ذرا سا عنصر ایمانداری اور راستبازی رہ گیا ہے وہ بھی مجبور ہو رہا ہے کہ یا تو جھوٹا اور جعل ساز اور رشوت گزار بن جائے، یا پھر کاروبار چھوڑ دے۔ پھر جو کچھ لوگوں سے ٹیکسوں کی شکل میں وصول کیا جاتا ہے اس کا ایک بہت بڑا حصہ پبلک کے حقیقی مفاد پر خرچ ہونے کے بجائے ناروا طریقے پر اڑایا جا رہا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس دولت کا بمشکل ۱۰ فیصدی حصہ ہی اپنے اصل مصرف میں صرف ہوتا ہے۔ باقی ۹۰ فی صدی یا تو غیر قانونی طور پر غبن اور خیانت کی نذر ہوتا ہے یا قانونی طور پر دفتری حکومت کے ڈھولوں کے پیٹ اور حکومت کے ٹھاٹھ جمانے میں کھپ جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ میرے اس اندازے کو مبالغے پر مبنی قرار دیا جائے مگر جن لوگوں کو مختلف محکموں کے اندرونی عملدرآمد سے کچھ بھی قریبی واقفیت ہے وہ اس اندازے میں مجھ سے اتفاق کریں گے۔

ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے جو کچھ کیا اور سوچا جا رہا ہے اس میں ہم کو دو بہت بڑی غلطیاں نظر آتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان ساری تجویزوں میں زیادہ تر بیرونی سرمایے پر اعتماد کیا جا رہا ہے اور اس کو یہاں آنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ حالانکہ بیرونی سرمایے سے ایک ملک کو اپنی تعمیر و ترقی میں جتنی مدد ملتی ہے اس سے بہت زیادہ سیاسی اور معاشی نقصان پہنچتا ہے۔ مجھے کوئی مثال ایسی نہیں

ملتی کہ کوئی ملک اس بلا کو دعوت دینے کے بعد سیاسی مغلوبی میں مبتلا ہونے اور معاشی لوٹ کھسوٹ کا تختۂ مشق بننے سے بچ گیا ہو۔ اور میرے علم میں یہ بات بھی نہیں ہے کہ ہمارے منتظمین ریاست کے پاس کوئی تعویذ ایسا موجود ہے جسے ملک کے گلے میں باندھ دینے سے یہ بلا ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گی۔

دوسری غلطی جو اس معاملہ میں ہم دیکھ رہے ہیں یہ ہے کہ ذرائع کا بہت بڑا حصہ حقیقی تعمیر و ترقی کے کاموں پر صرف ہونے کے بجائے ایسے کاموں پر صرف ہو رہا ہے جن سے پاکستان اپنی ظاہری شان و شوکت کے اعتبار سے دولت مند ملکوں کی شان سے لگا کھا سکے اور جسے دیکھ کر گھر کے ظاہر پرست اور باہر کے سطح بین لوگ اس ملک کے سربراہ کاروں کو داد دینے لگیں کہ انہوں نے واقعی اپنے ملک کو ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں لا بٹھایا ہے۔ یہ روش میری نگاہ میں اتنی ہی غلط ہے جتنی کسی ایسے قلیل المعاش آدمی کی روش غلط ہو سکتی ہے جو اپنی مالی حیثیت سے بڑھ کر ٹھاٹھ جمانے اور امیروں جیسا نظر آنے کی کوشش کرے۔ ایک فرد جب ایسا کرتا ہے تو لوگ اس کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔ کوئی صاحب عقل انسان اس شخص کو داد نہیں دیتا جو اپنی اور اپنے گھر والوں کی حقیقی ضروریات فراہم کرنے کے بجائے اپنی قلیل آمدنی کو ڈرائنگ روم کی سجاوٹ پر صرف کرے اور پچاس روپے کی آمدنی رکھتے ہوئے پانچ سو روپے والے کی طرح بن کر دکھائے پھر ایک قوم کے معاملہ میں اسی طریقہ کو آخر دانشمندانہ کیسے کہا جا سکتا ہے؟

سیاسی حالت اب ذرا ملک کی سیاسی حالت پر ایک نگاہ ڈالیے۔ میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے یہ بات صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت جو حالات یہاں پلتے جلتے ہیں وہ ملک کو انارکی اور ڈکٹیٹر شپ کی طرف لیے جا رہے ہیں۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں ملکی سیاست کی باگیں ہیں انہوں نے محض اپنی شخصی اور جماعتی خود غرضی کی بنا پر یہاں جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا ہے۔

انہوں نے طرح طرح کے قانونی اور غیر قانونی ہتھیاروں سے کام لے کر یہاں آزاد اخبار نویسی کا قریب قریب خاتمہ کر دیا ہے۔ اب یہاں کوئی آزاد اخبار، یا برسر اقتدار پارٹی پر تنقید کرنے والا اخبار، جی نہیں سکتا۔ صرف وہی اخبار پھل پھول سکتے ہیں جو خوشامد کریں، سچ کو چھپائیں، جھوٹ پھیلائیں، اور اس حد تک بے ضمیر و بندۂ شکم ہو جائیں کہ "عالم بالا سے آئے ہوئے" الہامات" کو اپنے مقالات کی شکل میں

شائع کرنے سے بھی انکار نہ کر سکیں۔ جو لوگ اس کھلی بے ایمانی کے لیے تیار نہ ہوں ان کے اخبار اول تو نکل ہی نہیں سکتے، اور اگر کسی نہ کسی طرح نکل آئیں تو زیادہ دیر تک چل نہیں سکتے۔

انہوں نے خبر رسانی کے ذرائع پر بھی خفی اور ظاہر طریقوں سے اپنا قبضہ قائم کر رکھا ہے۔ ان کی پوری کوشش یہ ہے کہ ملک کے اندر اور باہر صرف انہی کے مطلب کی خبریں شائع ہوں۔ دوسری تمام خبروں کا وہ پوری پابندی کے ساتھ بلیک آوٹ کرتے اور کراتے ہیں۔

انہوں نے ریڈیو کو ـــــ جو ایک پبلک ادارہ ہے اور پبلک کے خرچ پر چل رہا ہے ـــــ صرف اپنی پارٹی کا اجارہ بنا لیا ہے۔ جس آواز کو وہ اپنی اغراض کے مطابق پاتے ہیں صرف وہی ان نشر گاہوں سے بلند ہو سکتی ہے۔ دوسری کوئی آواز آج تک اس سے نہ سنی گئی ہے نہ سننے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ آزاد ملکوں کے ریڈیو پر آپ حکمراں پارٹی اور مخالف پارٹیوں کی خبریں اور خیالات یکساں طور پر سنتے ہیں۔ وہاں انتخابات میں اگر ملک کا صدر یا وزیر اعظم ریڈیو پر تقریر کرتا ہے تو اس کی مخالف پارٹی کا لیڈر بھی اسی طرح آزادی کے ساتھ اپنی بات کہتا اور کہہ سکتا ہے۔ لیکن یہاں کی نشر گاہوں کے قریب بھی کوئی ایسا شخص نہیں پھٹک سکتا جو ملک کے حکمرانوں کا معتوب ہو۔ بلکہ ہمارا ریڈیو پبلک کے خرچ پر ملک کی آبادی کو ہر وقت یہ باور کرانے میں مشغول رہتا ہے کہ اس ملک میں برسر اقتدار پارٹی کے لیڈروں کے سوا مرے سے کوئی اور پایا ہی نہیں جاتا۔

انہوں نے سیفٹی ایکٹ اور سیفٹی آرڈی ننس اور فرنٹیر کرائمز ریگولیشنز، اور ۱۸۱۸ء کے بنگال ریگولیشن تھرڈ اور ایسے ہی دوسرے جابرانہ قوانین کے ذریعہ سے شہری آزادیوں کو تقریباً معدوم کر دیا ہے۔ یہ قوانین ملک کی حفاظت کے لیے تو نہ پہلے درکار تھے، نہ آج درکار ہیں اور نہ درحقیقت ایسے اندھے جابرانہ قوانین کسی ملک کی حفاظت کے لیے کبھی درکار ہوا کرتے ہیں۔ پہلے انگریز ان قوانین کو اس لیے استعمال کر رہا تھا کہ اس ملک میں اس کے خلاف کوئی آزادی کی تحریک اٹھنے اور منظم ہونے نہ پائے۔ اور اب ہمارے برسر اقتدار لیڈر خود اپنی قوم میں جبر کے ان ہتھیاروں کو اس لیے استعمال کر رہے ہیں کہ یہ قوم کبھی اپنے لیڈر تبدیل کرنے کے قابل نہ ہو سکے۔ یہاں کوئی ایسی آواز زیادہ دیر تک برداشت نہیں کی جاتی جس سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ

اگر اس نے قبولِ عام حاصل کر لیا تو قوم کی رائے اپنے موجودہ حکمرانوں کے حق میں نہ رہیگی اور وہ ان کی جگہ دوسرے آدمیوں کو لے آنے پر آمادہ ہو جائے گی۔ بالفاظِ دیگر اب صورتِ حال یہ ہے کہ جو لوگ ایک دفعہ قوم کی رضامندی سے اس کے کندھوں پر سوار ہوئے تھے وہ اب اپنی سواری کو اس کی رضامندی پر منحصر نہیں رکھنا چاہتے بلکہ لگام اور چابک کے زور سے اس پر مستقلاً سوار رہنا چاہتے ہیں تاکہ اگر وہ انہیں اتارنا بھی چاہے تو نہ اتار سکے۔

انہوں نے تمام سرکاری ملازمین کو اپنی پارٹی کے والنٹیروں میں اور تمام سرکاری محکموں کو اپنی پارٹی کی شاخوں میں تبدیل کر لیا ہے۔ یہ ملازمین تنخواہ پبلک کے خزانے سے پاتے ہیں اور کام ان سے وہ لیا جاتا ہے جو دراصل مسلم لیگ کے والنٹیروں کو کرنا چاہیے۔ ان محکموں کا خرچ ملک کا خزانہ برداشت کرتا ہے اور ان سے کام اس طرح لیا جاتا ہے گویا کہ وہ بھی مسلم لیگ کی کوئی شاخ ہیں۔ جو لوگ برسرِ اقتدار سیاسی پارٹی سے اختلاف رکھتے ہیں آج ان کی ڈاک سنسر کی جا رہی ہے، ان کے تار روکے جا رہے ہیں، سی آئی ڈی کے بے شمار آدمی ان کا پیچھا کرنے میں لگے ہوئے ہیں، سرکاری محکموں اور ان کے ملازمین کا بہت سا وقت اور روپیہ ان کی نگرانی اور ان کی مزاحمت اور ان کے خلاف پروپگنڈا کرنے پر صرف ہو رہا ہے، پولیس اور مجسٹریٹوں اور حکامِ مال اور دوسرے سرکاری عملے کو ان کے مقابلے میں اس طرح استعمال کیا جا رہا ہے گویا وہ سب برسرِ اقتدار سیاسی پارٹی کے ملازم ہیں اور ان کا کام اس ملک کے اندر ہر اس دوسری جماعت کو دبانا اور روکنا اور کچلنا ہے جو اس سیاسی پارٹی کی مخالف ہو۔ میں پوچھتا ہوں کہ سرکاری ملازمین اور سرکاری محکموں اور سرکاری روپے کے اس استعمال کو کیسے جائز ثابت کیا جا سکتا ہے؟ کیا مسلم لیگ اور پاکستان ایک چیز ہیں؟ کیا مسلم لیگ اور ریاست ہم معنی ہیں؟ کیا ہر وہ شخص جو مسلم لیگ سے اختلاف کرے ملک کا باغی اور دشمن ہے؟ کیا یہاں مسلم لیگ کے سوا کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے ملک کی بھلائی کے لیے اپنی صوابدید کے مطابق کام کر سکے؟ اور کیا آئین و قانون کی نگاہ میں مسلم لیگ اور دوسری پارٹیوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے؟ اگر ان سوالات کا جواب اثبات میں نہیں دیا جا سکتا ——— اور کون ہے جو ایمانداری کے ساتھ ان کا جواب اثبات

میں دے سکتا ہو؟ ـــــ تو کیا حق پہنچتا ہے ایک سیاسی پارٹی کو کہ وہ برسرِ اقتدار آ کر ملک کی دوسری پارٹیوں کے خلاف پبلک کے ملازمین اور پبلک کے محکموں اور پبلک کے روپے کو اس طرح استعمال کرے؟ کیا یہ کھلی خیانت نہیں ہے جس کا ارتکاب روزِ روشن میں اتنے بڑے پیمانے پر کیا جا رہا ہے؟ کیا اب یہاں یہ اصول چلیگا کہ ملک کی جو پارٹی بھی ایک دفعہ برسرِ اقتدار آ جائے وہ خود اقتدار پر قابض رہنے اور دوسروں کا راستہ روکنے کے لیے حکومت کی طاقت اور اس کے ذرائع سے کام لیا کرے؟

سب سے زیادہ خطرناک حرکت جو یہ لوگ کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ انہوں نے انتخابات کو اس ملک میں بالکل دھن، دھونس، دھوکے اور دھاندلی کا کھیل بنا کر رکھ دیا ہے اور اس کھیل میں یہ حکومت کے اختیارات اور ذرائع کو کھلم کھلا استعمال کر رہے ہیں۔ یہ صرف ایک بددیانتی ہی نہیں ہے بلکہ صریحاً ملک کی تخریب ہے۔ یہ ایک سخت حماقت ہے جس کے خوفناک نتائج کا شاید انہیں اندازہ نہیں ہے۔ یہ اس ملک کے ساتھ سب سے بڑی غداری، بدخواہی اور دشمنی ہے کہ یہاں کے لوگوں کو جمہوری و آئینی ذرائع سے مایوس کر دیا جائے اور انہیں یقین دلایا جائے کہ یہاں اب جو سیاسی تغیر بھی ہو گا غیر آئینی اور غیر جمہوری طریقوں سے ہی ہو سکے گا۔

ہر شخص جو کچھ بھی عقل و بصیرت رکھتا ہے، اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ تغیر کو روکنا تو کسی انسانی طاقت کے بس میں نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ فطرت کے ناگزیر تقاضوں میں سے ایک ہے اور دنیا کے ہر شعبۂ زندگی کی طرح سیاسی نظام میں بھی اس کا آنا لازمات میں سے ہے۔ جمہوری انتخابات کا اصل فائدہ یہ ہے کہ وہ فطرت کے اس تقاضے کو ایک پُرامن اور معقول راستہ فراہم کر دیتے ہیں جس سے وہ بغیر کسی الٹ پلٹ اور اکھیڑ پچھاڑ کے ایک غیر مقبول نظام کی جگہ دوسرا نسبتہً زیادہ مقبول نظام لے آتا ہے اور ملک کے ارتقاء میں کوئی فساد انگیز خلل برپا نہیں ہونے پاتا۔ اگر یہ راستہ کھلا نہ ہو تو فطرت اپنے تقاضوں کی تکمیل کے لیے پھر انقلاب کے وہ راستے کھولتی ہے جن سے بادشاہتوں اور مطلق العنان حکمرانیوں کے تختے اُلٹتے رہے ہیں اور آج بھی الٹ رہے ہیں

اور جن کی بدولت قوموں کے مزاج بسا اوقات ایسے بگڑے ہیں کہ صدیوں تک سنبھلنے نہ پائے ہیں۔ جمہوری انتخابات ہمیں اس پُرخطر راستے پر جانے سے بچا لیتے ہیں۔ لیکن اُن کا یہ حقیقی فائدہ ہم کو صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جبکہ ہمارے ہاں انتخابات بالکل ایمانداری کے ساتھ آزادانہ فضا میں ہوں۔ قوم کے ہر عنصر کو یکساں اور پورا موقع حاصل ہو کہ وہ اپنے خیالات اور پروگرام عوام الناس کے سامنے پیش کرے۔ عوام الناس کو بے لاگ طریقہ سے یہ موقع دیا جائے کہ وہ ہر ایک کی بات سنیں سمجھیں، اور خود فیصلہ کریں کہ کس کا پروگرام ان کے نزدیک درست اور مفید ہے۔ پھر جو شخص جس کے حق میں بھی اپنا ووٹ استعمال کرنا چاہے، کسی دباؤ اور لالچ کے بغیر آزادی کے ساتھ استعمال کرے۔ رائے شماری میں کسی دھاندلی سے کام نہ لیا جائے اور باشندگانِ ملک کی واقعی اکثریت جس کے حق میں بھی ہو اس کے سپرد ملک کا انتظام کر دیا جائے۔ یہ شرطیں پوری ہوں تو انتخاب کے نامزد کرنا، دونوں یکساں ہیں۔

اب دیکھیے کہ آپ کے ملک میں انتخابات کس ڈھب سے ہو رہے ہیں۔

یہاں انتخاب کا پہلا مرحلہ اس طرح طے ہوتا ہے کہ مخالف پارٹیوں کو پریس کی طاقت سے بالکل یا بڑی حد تک محروم کر دیا جاتا ہے۔ اپنے زیر اثر اخبارات کے ذریعے سے ان کے خلاف جھوٹ کی ایک ہمہ گیر مہم چلائی جاتی ہے۔ خبر رسانی کے ذرائع نہ صرف ان کا بائیکاٹ کرتے ہیں بلکہ ان کی طرف غلط خبریں منسوب کر کے پھیلاتے ہیں۔ نئے نئے بہتان تراش تراش کر ان کے سر تھوپے جاتے ہیں۔ مولویوں اور پیروں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں اور روپے دے دے کر ان سے خطرے کی گھنٹیاں بجوائی جاتی ہیں۔ اصل مسائلِ زندگی سے لوگوں کی توجہ ہٹا کر طرح طرح کے مذہبی اور غیر مذہبی جھگڑے کھڑے کیے جاتے ہیں۔ اور پوری کوشش کی جاتی ہے کہ عوام الناس کو جتنا دھوکا دیا جا سکتا ہے دیا جائے اور انہیں بے لاگ طریقے سے صاف فضا میں کچھ سوچنے اور سمجھنے کے قابل نہ چھوڑا جائے۔

اس کے بعد انتخابات کے دوسرے مرحلے کی مہم اس طرح سر کی جاتی ہے کہ رائے دہندوں کی فہرستوں میں ہزارہا جعلی ووٹروں کے نام درج کرائے جاتے ہیں اور ہزارہا اصلی ووٹروں کے

نام ساقط کرا دیے جاتے ہیں۔ یہ خدمت سرکاری عملے سے لی جاتی ہے۔ اور پھر اس خرابی کی اصلاح کے لیے چاہے کوئی کتنا ہی شور مچائے، اس کی طرف ذرا توجہ نہیں کی جاتی۔

پھر انتخاب کی تیسری مہم یوں سر ہوتی ہے کہ صاف صاف حکم دے کر میجسٹریٹوں سے اپنے مخالفین کے کاغذات نامزدگی نامنظور کرائے جاتے ہیں۔ اپنے خاص خاص آدمیوں کو بلامقابلہ منتخب کرایا جاتا ہے۔ اور مخالف پارٹیوں کے با اثر آدمیوں کو عین وقت پر گرفتار کر لیا جاتا ہے۔

اس کے بعد پولیس اور پٹواریوں اور نمبرداروں اور محکمۂ مال کے افسروں اور بسا اوقات ڈپٹی کمشنروں تک کے ذریعہ سے رائے دہندوں کو کھلم کھلا ڈرانے، دھمکانے اور لالچ دلانے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تاکہ وہ برسر اقتدار پارٹی کے امیدواروں کو ووٹ دیں۔ بعض مقامات پر خود پولیس کے ذریعہ سے رائے دہندوں میں روپیہ تک تقسیم کیا گیا ہے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے جو علاقے کے لوگوں کو معلوم نہ ہو۔ رہے سرکاری ملازم، تو نہ صرف وہ خود بلکہ ان کے رشتہ دار تک برسر اقتدار پارٹی کو ووٹ دینے کے پابند ہیں اور بارہا یہ مثالیں ہمارے سامنے آچکی ہیں کہ تھانہ داروں اور نمبرداروں کے ذریعہ سے لوگوں کو یہ دھمکی دی گئی ہے کہ اگر تمہارا ووٹ سرکار (یعنی مسلم لیگ) کے خلاف گیا تو اپنے بیٹے یا بھائی یا داماد کو ملازمت سے برخاست سمجھو۔

پھر اصل انتخاب کا موقع آتا ہے اور اس وقت کوئی قسم بے ایمانی کی ایسی نہیں ہوتی جو نہ کی جاتی ہو۔ ہزارہا کرائے کے آدمی لاریوں اور ٹرکوں میں بھر بھر کر لائے جاتے ہیں اور وہ علی الاعلان پولیس اور پریزائیڈنگ افسروں کے سامنے جعلی ووٹ ڈالتے ہیں اور اعتراض کرنے والوں کی کوئی نہیں سنتا۔ ایک ایک شخص پندرہ پندرہ اور بیس بیس مرتبہ مختلف ناموں سے آتا ہے اور ووٹ ڈالتا ہے اور فی ووٹ ایک مقرر رقم حاصل کر لیتا ہے۔ پنجاب میں ایک مثال ایسی بھی دیکھی گئی کہ ایک شخص نے ۵۱ مرتبہ ووٹ ڈالا۔ حد یہ ہے کہ قوم کی بیٹیوں تک کو یہ سکھایا جاتا ہے کہ وہ کبھی کسی کی بیوی بن کر ووٹ ڈالیں اور کبھی کسی کی بیٹی بن کر۔ یہ کام اسکولوں اور کالجوں کی

لڑکیوں تک سے لینے میں شرم نہیں کی جاتی اور کچھ نہیں سوچا جاتا کہ ہم اپنی قوم کی لڑکیوں کو یہ کیسے اخلاق سکھا رہے ہیں پھر جو سرکاری عملہ پولنگ اسٹیشنوں پر مقرر کیا جاتا ہے وہ اپنے پیٹ کی خاطر "اپنی سرکار" کو جتانے کے لیے ہر طرح کے جتن کرتا ہے۔ لوگوں سے جبراً مسلم لیگ کے بکس میں پرچی ڈلوانا، مخالف پارٹی کے بکسوں میں ڈالنے والوں سے پرچیاں چھین لینا، ایک بکس کو توڑ کر اس کی پرچیاں دوسرے بکس میں ڈال دینا، یہ کوئی شاذ و نادر واقعات نہیں ہیں، بلکہ بڑے پیمانے پر دیکھے گئے ہیں اور دیکھے جا رہے ہیں۔

یہ ہیں وہ "جمہوری انتخابات" جو اس ملک میں ہو رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسے انتخابات منعقد کرنے کا فائدہ کیا ہے؟ کیا ایسے ہتھکنڈوں سے جیتنے والوں کے متعلق پبلک یہ سمجھ سکتی ہے کہ وہ فی الواقع اُس کے حقیقی نمائندے ہیں جو اُس کی آزاد مرضی سے منتخب ہوئے ہیں؟ کیا ایسے ہتھکنڈوں سے جیتنے والے خود اپنی جگہ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ اپنی خدمات اور اپنے پروگرام سے عوام کو مطمئن کر کے برسرِ اقتدار آئے ہیں اور آئندہ ان کے پھر برسرِ اقتدار آنے کا انحصار خدمت اور پروگرام کی صحت ہی پر ہے، دھوکے اور دھاندلی اور دھونس اور دھن پر نہیں ہے؟ اور کیا ایسے ہتھکنڈوں سے ہارنے والے یہ سوچ کر مطمئن ہو سکتے ہیں کہ ان کے ہارنے کی اصل وجہ عوام میں ان کے کام اور پروگرام کا غیر مقبول ہونا ہے اور آئندہ اگر وہ زیادہ مقبولیت حاصل کریں تو وہ انتخابات میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی صاحبِ عقل آدمی جو ان حالات سے واقف ہو ان میں سے کسی سوال کا جواب بھی اثبات میں نہیں دے سکتا۔ پھر یہ کیسے امید کی جا سکتی ہے کہ ہمارے ملک میں انتخابات فطرت کی تغیر پسندی کو غیر آئینی انقلابات کے راستے پر جانے سے روک سکیں گے اور پُرامن ارتقا کے راستے پر ڈال سکیں گے؟

مَیں نے انتہائی تشویش کے ساتھ یہ بات دیکھی ہے کہ ہر انتخابی تجربے کے بعد جمہوری طریقوں سے لوگوں کی مایوسی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ پنجاب کے انتخاب کے بعد متعدد نوجوان مجھے ایسے ملے جو کہتے تھے کہ یہاں جمہوری طریقوں سے کوئی تغیر نہیں ہو سکتا۔ پھر سرحد کے تجربے نے

اس طرح سوچنے والوں کی تعداد اور زیادہ بڑھا دی۔ میں ان باتوں کو سنتا ہوں اور اس ملک کے تاریک مستقبل کا تصور کر کے میری روح کانپ جاتی ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ کسی ملک کے نوجوانوں میں ایسے احساسات پیدا ہو جانے کے معنی کیا ہیں۔ اسی بنا پر میں پوری دلسوزی کے ساتھ ارباب اقتدار سے کہتا ہوں کہ خدارا اپنے ملک کو اس تباہی کے راستے کی طرف نہ دھکیلیے۔ اس میں نہ ہماری خیر ہے، نہ آپ کی خیر ہے، نہ اس ملک کی خیر ہے!

دستور کا مسئلہ | آخر میں ایک نہایت اہم مسئلہ ملک کے دستور کا ہے جو چار سوا چار سال سے ٹل رہا ہے۔

اس معاملہ میں ہمارے ارباب اقتدار کی روش ایک مستقل وجہ تشویش بنی ہوئی ہے۔ وہ ابتدا سے ملک کا دستور ملک کے باشندوں کی تمناؤں اور آرزوؤں کے بجائے اپنی مرضی کے مطابق بنانے پر تلے رہے ہیں پہلے انیس مہینے تک وہ اسی بات کو ٹالتے رہے کہ اسلام کو دستور کی بنیاد قرار دینے کا سرکاری طور پر اعلان کریں۔ پھر جب لوگوں نے ہر طرف سے مطالبہ کیا تو مجبوراً قرارداد مقاصد پاس کی لیکن اس کے بعد ملک کے نظم و نسق میں اور حکومت کی پالیسی میں کوئی جزوی سے جزوی تغیر بھی ایسا نہیں کیا گیا جس سے معلوم ہوتا کہ فی الواقع یہ لوگ ملک کے نظام کو اُن اصولوں پر ڈھالنا چاہتے ہیں جو قرارداد مقاصد میں بیان کیے گئے ہیں۔ جیسا کہ میں اس سے پہلے اپنی ایک تقریر میں کہہ چکا ہوں یہ قرارداد ایک انوکھی بارش تھی کہ نہ اس سے پہلے کوئی گھٹا اٹھی اور نہ اس کے بعد کسی قسم کی روئیدگی ہوئی۔ اگر حقیقت میں ان کے اپنے مقاصد بھی وہی ہوتے جو انہوں نے اس قرارداد میں بیان کیے تھے تو اس سے پہلے کچھ آثار ایسے پائے جانے چاہییں تھے جو پتہ دیتے کہ اسلامی نظام زندگی کو برپا کرنے کے لیے ملک کے سربراہ کاروں میں کوئی رجحان پیدا ہو رہا ہے۔ لیکن بارش سے پہلے اس طرح کی کوئی گھٹا اٹھتی نہ دیکھی گئی۔ پھر کم از کم اتنا ہی ہونا چاہیے تھا کہ قرارداد پاس کر لینے کے بعد حکام کے رویہ میں، حکومت کی پالیسی میں، ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی ترمیمات میں، ملک کے قوانین میں، تعلیم کے نظام میں، سول سروس وغیرہ کے طریق تربیت میں، اور

فوج کے طور طریقوں میں اسلام کے منشا کے مطابق کوئی تبدیلی رونما ہونی شروع ہو جاتی۔ مگر اس اتفاقی بارش کے بعد ایسی کوئی روئیدگی بھی کسی طرف ابھرتی نظر نہ آئی۔ بس ایک جادو کی سی برسات تھی جو مداری نے لوگوں کے مطالبے پر اچانک برسا دی۔

مارچ ۱۹۴۹ء سے ستمبر ۱۹۵۰ء تک پورے ۱۹ مہینے پھر اس انتظار میں گزر گئے کہ قرار دادِ مقاصد کی تفسیر ایک تفصیلی دستور کی شکل میں کیا پیش کی جاتی ہے۔ آخر کار وہ سفارشات ہمارے سامنے آئیں جو بنیادی حقوق اور بنیادی اصولوں کے متعلق دستور ساز اسمبلی کی مقرر کردہ کمیٹیوں نے مرتب کی تھیں۔ انہیں دیکھ کر سارا ملک حیران رہ گیا کہ وہ دراصل قرار دادِ مقاصد کی تفسیر نہیں بلکہ عملاً اس کی تنسیخ تھیں۔ ان میں اسلام اور جمہوریت دونوں ہی پر کچھ اس بیدردی کے ساتھ چھری چلائی گئی تھی کہ ملک کے سارے گروہ اس پر چیخ اٹھے۔ علماء، اور سیاسی لیڈر، اخبارات اور عوام، اور خود مسلم لیگ کے بہت سے ایماندار لوگ، غرض سب ہی نے بالاتفاق ان سفارشات کو غیر اسلامی اور غیر جمہوری قرار دیا۔ اوّل اوّل پوری کوشش کی گئی کہ انہیں عین اسلام اور عین جمہوریت ثابت کیا جائے۔ مگر جب دیکھ لیا گیا کہ پاکستان کے لوگ آنکھوں دیکھتے یہ جنتی مکھی نہیں نگل سکتے تو معاملہ پھر کمیٹیوں کے حوالہ کر دیا گیا جس پر آج چودہ مہینے گزر چکے ہیں۔

اب سنا جا رہا ہے کہ عالمِ بالا میں پھر اسی طرح کی ایک نئی سازش کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے جیسی ۱۹۵۳ء میں نظامِ اسلامی کے مطالبے کو روکنے کے لیے کی گئی تھی۔ اس وقت یہ گمان کیا گیا تھا کہ نظامِ اسلامی کا مطالبہ محض چند اشخاص کا اٹھایا ہوا ہے، انہیں پکڑ کر قید کر دیا جائے تو پھر کوئی اس سوال کو لے کر اٹھنے والا نہ رہے گا۔ چنانچہ ایک پوری بنی ہوئی سازش کے ساتھ کشمیر کے معاملہ میں ایک سراسر جھوٹا الزام گھڑ کر ایک شخص پر چسپاں کیا گیا اور اسے اور اس کے ساتھیوں کو قید کر دیا گیا۔ مگر یہ اندازہ غلط ثابت ہوا اور اس تدبیر کے باوجود بھی کچھ کرنا پڑا جو اس کے بغیر کرنا پڑتا۔ اب پھر یہ غلط اندازہ کیا جا رہا ہے کہ اپنے حسبِ منشا دستور بنا کر نافذ کرنے میں اگر کوئی ان کی راہ کا روڑا بن سکتا ہے تو وہی چند اشخاص ہیں۔ چنانچہ ان کو ہٹانے

کے لیے پھر کچھ تدبیریں سوچی جا رہی ہیں۔ مجھے ان تدبیروں کی تو کوئی پروا نہیں ہے جس کا جی چاہے انہیں پھر آزما کر دیکھ لے۔ البتہ سراسر خیر خواہی کی بنا پر میں ان لوگوں سے ایک بات صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ حضرات! اگر آپ لوگ سیدھی سیدھی طرح ایمانداری سے خدا کے دین کی خدمت کریں تو ہم سے زیادہ آپ کا ہمدرد اور مددگار کوئی نہ ہوگا۔ ہم اس کام میں اپنی کوئی غرض نہیں رکھتے۔ ہمارا یہ خواہش ہرگز نہیں ہے کہ آپ اقتدار کی مسند سے ہٹیں اور ہم آپ کی جگہ لیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ خدا کے دین کو اس کی اصلی شکل اور روح میں از سرِ نو قائم کیا جائے۔ یہ کام آپ کریں تو ہم آپ کے لیے ایک ادنیٰ چپراسی کی خدمت انجام دینا بھی اپنے لیے باعثِ سعادت سمجھیں گے۔ لیکن اگر آپ اس کے برعکس کوئی دوسرا نظام یہاں لانا چاہیں تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں کچھ لوہے کے چنے ایسے موجود ہیں جن کو چبانے کی کوشش میں دانت تو ٹوٹ سکتے ہیں مگر وہ چب نہیں سکتے۔

اسباب

یہ ملک کے موجودہ حالات پر میرا تبصرہ ہے۔ اگر حالات فی الواقع اس سے کچھ بہتر ہوں اور میرے اس تبصرے میں سے کوئی چیز بھی واقعات کے لحاظ سے غلط ثابت ہو جائے تو مجھ سے بڑھ کر کسی کو خوشی نہ ہوگی۔ کیونکہ میری تو دلی خواہش یہ ہے کہ یہ خرابیاں یہاں موجود نہ ہوں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ جو شخص بھی حالات کا گہری نظر سے جائزہ لے گا وہ اس تبصرے کو مبالغہ آمیز نہیں بلکہ حقیقتِ نفس الامری سے کچھ کم ہی پائے گا۔

اب میں مختصر طور پر یہ بتاؤں گا کہ ان خرابیوں کے اسباب کیا ہیں، کیونکہ اسباب کو سمجھے بغیر علاج ممکن نہیں ہے۔

ان کا پہلا اور بنیادی سبب دلوں کا بالعموم خوفِ خدا اور فکرِ آخرت سے خالی ہو جانا ہے۔ یہی چیز ہے جس نے لوگوں کو شترِ بے مہار بنا دیا ہے، سیرت و اخلاق کی چٹیں کھول کر دی ہیں، اور زندگی کے ہر شعبے میں اس کے برے اثرات ظاہر ہو رہے ہیں۔ جس آدمی کے دل میں خدا کا خوف نہ ہو اور جسے

یہ احساس نہ ہو کہ اُسے کبھی اپنے خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال کا حساب بھی دینا ہے، وہ صرف نماز اور روزے سے ہی غفلت نہ کریگا، بلکہ آپ کسی معاملے میں بھی اس سے دیانت، امانت، راستبازی اور اخلاص کی امید نہیں رکھ سکتے۔ دوسری قومیں تو خیر و سیرت کے لیے دوسری بنیادیں تلاش کر لیتی ہیں جن پر ان کے ہاں اخلاق کی عمارت کسی نہ کسی حد تک استوار ہو جاتی ہے۔ مگر مسلمان تو جب تک بالکل ہی کافر نہ ہو جائے، خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کے سوا سیرت و اخلاق کے لیے کوئی دوسری بنیاد سرے سے پا ہی نہیں سکتا۔ اور یہ بنیاد کھو دینے کے بعد وہ نہ دین کا رہتا ہے نہ دنیا کا۔

دوسرا سبب عوام کی جہالت ہے جس سے ہماری اپنی ہی قوم کے مخصوص طبقے طرح طرح کے ناجائز فائدے اٹھا رہے ہیں۔ مذہبی فتنے اٹھتے ہیں تو اسی جہالت کی بدولت، اور سیاسی غلط کاریاں پھلتی پھولتی ہیں تو اسی کے بل بوتے پر۔ ایک جمہوری نظام جس میں اقتدار کا سرچشمہ عوام کی رائے ہو کبھی صحیح طور پر نہیں چل سکتا جب تک کہ عوام کی اکثریت بھلے اور بُرے کی تمیز سے آشنا اور معاملات کو سمجھنے کے قابل نہ ہو۔ یہ حالت جب تک رہیگی ہر انتخاب کے موقع پر تمام وہ طبقے جن کا مفاد موجودہ بگاڑ سے وابستہ ہے، مل جُل کر عوام کی اکثریت کو فریب اور خوف اور لالچ سے متاثر کریں گے اور پھر اقتدار پر قابض ہو کر اصلاح کی ہر کوشش کو ناکام اور بگاڑ کی ہر تدبیر کو کامیاب بناتے رہیں گے۔

تیسرا بڑا سبب ہماری قوم کے تعلیم یافتہ طبقے کی بے حسی، نافرض شناسی، اور ملک کے مستقبل سے بے پروائی ہے۔ اُن میں سے جو اہلِ قلم ہیں، وہ اکثر و بیشتر آج اپنی ذاتی اغراض کی خاطر یا تو اپنی قوم کو گمراہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں، یا پھر ارباب نشاط بن کر رہ گئے ہیں جو سرکاری ملازمت میں ہیں ایک عنصرِ جلیل کے سوا، انہوں نے تنخواہوں کے عوض اپنا ضمیر بیچ ڈالا ہے اور اپنے آپ کو اس طرح اربابِ اقتدار کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ جس طرح چاہیں آئین اور انصاف کے خلاف ان سے اپنی خواہشات کے مطابق کام لے سکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "ضمیر" نام کی کوئی چیز ان کے سینوں میں کہیں موجود ہی نہیں ہے۔ رہے عام تعلیم یافتہ لوگ تو ان کی بے حسی کا اندازہ اس سے

کر لیجیے کہ پنجاب کے پچھلے انتخابات میں، جبکہ پانچ سال کے لیے صوبے کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا، ان کی بمشکل ۲ فیصدی آبادی ووٹ دینے کے لیے آئی، اور عوام کی رائے کو تیار کرنے میں تو ان کے ۱/۴ فی صدی حصے نے بھی مشکل ہی سے کوئی دلچسپی لی ہوگی۔ باقی سب کے سب اس سوال سے بالکل بے پروا تھے کہ کن لوگوں کے ہاتھ میں آئندہ پانچ سال کے لیے صوبے کے انتظام کی باگیں دی جاتی ہیں۔ گویا یہ انتخابات ان کے ملک میں نہیں بلکہ کہیں اور ہو رہے تھے اور ان کا کوئی اچھا یا برا اثر خود ان کی زندگی پر تو پڑنا ہی نہیں تھا۔ غور کیجیے کہ جس ملک کے اہل دماغ طبقے کا یہ حال ہو اس کو تنزل اور تباہی کی طرف جانے سے کیسے بچایا جا سکتا ہے!

چوتھا سبب، جو اپنی اہمیت میں دوسرے اسباب سے کچھ کم نہیں ہے، ہمارے علماء دین کا بالعموم اپنے فرض سے غافل ہونا، بلکہ اپنے منصب کے خلاف کام کرنا ہے۔ ان میں سے بہت کم ہیں جنہیں اس امت کو لگی ہوئی اصلی اور حقیقی بیماریوں کا کچھ احساس اور ان کے علاج کی کوئی فکر لاحق ہے۔ باقی سب یا تو کسی علامتِ مرض کی جڑ کاٹنے میں لگے ہوئے ہیں، یا اس مریضِ نیم جان کو کچھ مزید عارضے لگانے میں مشغول ہیں، یا پھر وہ اپنا سارا زور بیگار کے علمبرداروں کو چھوڑ کر اصلاح کی کوشش کرنے والوں کے خلاف صرف کر رہے ہیں کیونکہ کسی نہ کسی وجہ سے ان کو پہلے گروہ کی بہ نسبت دوسرے گروہ کا وجود زیادہ ناگوار ہے۔

اس حالت کا علاج کیا ہے؟ اور ہم اس کے لیے کیا کر رہے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں؟ یہ ایک تفصیل طلب سوال ہے جس پر گفتگو کے لیے آج کی صحبت کافی نہیں ہے۔ اس کا جواب میں اپنی اختتامی تقریر میں دونگا۔